عالم اسلام..........جدیدیت وروایت کی کشمکش

قسط ششم

عالم اسلام میں جدیدیت و روایت کی کشمکش کے دوسرے حصے میں ہم جدیدیت پسند مفکرین کے افکار انہی کی کتابوں سے پیش کرر ہے ہیں۔اس حصے میں ہم برعظیم پاک و ہند اور مصر کے جدیدیت پسند مفکرین کے افکار کا خلاصہ پیش کرر ہے ہیں۔سب سے پہلے سر سید احمد خانؒ، علامہ اقبالؒ، مولانا شبلیؒ، مولانا سندھیؒ اور علامہ مشرقی صاحب کے افکار پیش کیے جار ہے ہیں۔آخری حصے میں جدیدیت کے بارے میں مغربی مفکرین کے حوالے اور عالم اسلام کے دیگر حصوں کے جدیدیت پسند مفکرین کے افکار کو شامل کیا جائے گا۔

سر سید چھپا پادری تھے: محسن الملک

سر سید کے دستِ راست نواب محسن الملک:

''یہ سچ ہے کہ ہمارے مسلمہ نے شدو مد کے ساتھ ظاہر بھی کر دیا جس کی وجہ سے تمام مسلمان اور اکثر علما کو ان کے اسلام پر قائم رہنے میں شبہ تھا اور بعض نے یہاں تک کہ کفر کے فتوے بھی دے دیے اور ان کو کیا کہوں، خود مجھ کو بہت سے مسائل میں ان سے اختلاف کرنا پڑا، بحث و مباحثے رہے''۔[مجموعہ لکچرز محسن الملک ص ۵۰۸]

''شاید سب سے پہلے میں نے ہی ان کے کفر کا فتویٰ دیا تھا، ان کو چھپا پادری کہا''۔[مجموعہ لکچرز محسن الملک ص ۴۱۲]

سر سید نے تفسیر میں جا بجا ٹھوکر کھائی: حالی

بہت سے مقامات ان کی تفسیر میں ایسے بھی موجود ہیں جن کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایسے عالی دماغ شخص کو کیونکر ایسی تاویلات باردہ پر اطمینان ہو گیا اور کیونکر ایسی فاحش غلطیاں ان کے قلم سے سرزد ہوئی ہیں''۔[مقالاتِ حالی (۱) ص ۲۲۵]

ایک اور موقع پر بیان کرتے ہیں:

''آخر عمر میں سر سید کی خود رائی یا جو وثوق کہ ان کو اپنی رایوں پر تھا وہ حدِ اعتدال سے متجاوز ہو گیا تھا۔بعض آیاتِ قرآنی کے وہ ایسے معنی بیان کرتے تھے جن کو سن کر تعجب ہوتا تھا کہ کیونکر ایسا عالی دماغ آدمی ان کو کمزور اور بودی تاویلوں کو صحیح سمجھتا ہے۔ہر چند کہ ان کے دوست ان تاویلوں پر ہنستے تھے مگر وہ کسی طرح اپنی رائے سے رجوع نہ کرتے تھے''۔[حیاتِ جاوید (۲) ص ۵۲۲]

مولانا حالی نے ''حیاتِ جاوید'' میں ان مسائل کی ایک طویل فہرست پیش کی ہے جن میں سر سید نے علماءِ سلف سے

اختلاف کیا ہے۔ یہ فہرست کئی صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔اس میں جہاں انبیاء کرام کے معجزات کا ذکر ہے، وہ تحریر کرتے ہیں:
معجزات کی تفسیر میں جو کچھ سرسید نے لکھا ہے وہ غالباً پہلے کسی مفسر نے نہیں لکھا۔[حیاتِ جاوید(۲)ص ۲۶۵]

ڈپٹی نذیر احمد کی نظر میں سرسید کی تفسیر

''مجھ کو ان کے معتقدات باسرہا تسلیم نہیں۔سید احمد خاں صاحب کی تفسیر ایک دوست کے پاس دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میرے نزدیک وہ تفسیر ''دیوانِ حافظ'' کی ان شروح سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جن کے مصنفین نے چوتڑوں سے کان گانٹھ کر سارے دیوان کو کتاب تصوف بنانا چاہا۔ جو معانی سرسید احمد خاں صاحب نے منطوقِ آیاتِ قرآنی سے اپنے پندار میں استنباط کیے (اور میرے نزدیک زبردستی مڑھے اور چپکائے) قرآن کے منزل من اللہ ہونے سے انکار کرنا سہل ہے اور ان معانی کو ماننا مشکل............ یہ وہ معانی ہیں جن کی طرف نہ خدا کا ذہن منتقل ہوا، نہ جبریل حامی وحی کا، نہ رسولؐ خدا کا، نہ قرآن کے کاتب و مدون کا، نہ اصحاب کا، نہ تابعین کا، نہ جمہورِ مسلمین کا''۔[موعظہ حسنہ ص ۱۷۵]

سرسید امام ابوحنیفہؒ پر تبریٰ نہ کریں: وقار الملک

اگر آپ کے خط میں امام ابوحنیفہؒ پر طعن وتشنیع نہ ہوتی اور آپ ان کو ضمناً حیلہ باز نہ کہتے تو میں اس خاص جملے کے جواب ہی کو قلم انداز کر جاتا لیکن اس بات کی آپ مجھ سے توقع چھوڑ دیں کہ میں اپنے ان پیشوایانِ دین پر، جنھوں نے نہایت نیک نیتی سے آپ ہی کی مانند اپنی تمام عمر امتِ اسلامیہ کی درستی احوال میں صرف کی ہو، تبراً سننے پر راضی ہوں''۔[سیلیکٹیڈ ڈاکومنٹس ص ۱۸۵۔۱۸۶]

سید صاحب ایسے مضامین نہ لکھتے: وقار الملک

علی گڑھ سے سرسید کے نام ۱۲ اگست ۱۸۷۲ء کو وقار الملک نے خط لکھا اور تہذیب الاخلاق کے مضامین کے منفی اثرات پر تنقید کی۔اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایے:

''یہاں کے لوگوں کی رائے سے میں آپ کو صحیح صحیح اطلاع دیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اس مدرسہ کی طرف سے تو اس وقت تک کسی کو شکایت نہیں ہے، ہاں، تہذیب الاخلاق کے مضامین تازہ کے سبب سے البتہ لوگوں کو ایک بدگمانی ہے۔لیکن وہ بدگمانی آپ کی ذات کے ساتھ ہے، نہ اس مدرسہ کی نسبت...... جب تک اس مدرسہ کے لیے بے لگام مضمونوں کی فی الجملہ روک تھام ضرور ہے۔آپ کو شاید معلوم نہیں لیکن میں دیکھتا ہوں کہ وہ مضامین ایک قومی مزاحمت کرتے ہیں اس چندہ کے واسطے۔اور کیا آپ کو ایسے مضامین کے سوا اور کچھ مضمون ہی نہیں ملتا؟''[سیلیکٹڈ ڈاکومنٹس،ص ۱۸۳]

سرسید کا انگریزی تعلیم کے بارے میں مؤقف:

''اب تو گویا بالاتفاق تمام مسلمان اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انگریزی پڑھنے اور علومِ جدیدہ کے سیکھنے سے مسلمان اپنے عقائد مذہبی میں سست ہو جاتے ہیں بلکہ ان کہ لغو سمجھنے لگتے ہیں اور لامذہب ہو جاتے ہیں، اور اسی سبب سے مسلمان اپنے لڑکوں کو انگریزی پڑھانا نہیں چاہتے۔مسلمانوں پر کیا موقوف ہے، انگریز بھی ایسا ہی خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر ہنٹر صاحب نے اپنی کتاب میں جو حال میں انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی نسبت لکھی ہے یہ فقرہ مندرج فرمایا ہے ''کوئی نوجوان، خواہ ہندو خواہ مسلمان، ایسا نہیں ہے جو ہمارے انگریزی مدرسوں میں تعلیم پائے اور اپنے بزرگوں کے مذہب سے بداعتقاد ہونا نہ سیکھے۔ایشیا کے شاداب اور تروتازہ مذہب جب مغربی (یعنی انگریزی) علوم کی سچائی کے قریب آتے ہیں، جو مثل برف کے ہے تو سوکھ کر لکڑی ہو جاتے ہیں۔آمنا وصدقنا، یہ قول ڈاکٹر ہنٹر صاحب کا بالکل سچ اور بتمامہ، سچ ہے''۔[تہذیب

الاخلاق (۲) ص ۱۹۲]

یورپی پروفیسر کے بغیر تعلیم ٹھیک نہیں: سرسید

میری آرزو ہے کہ ہماری قوم خود اپنے اتفاق سے قومی اسکول اور قومی کالج قائم کرے۔ مگر ہم کو کسی اسکول کے قائم کرنے کا ارادہ نہیں کرنا چاہیے جب تک کہ ہم انٹرنس کلاس کی پڑھائی اسکول قائم نہیں کر سکتے......اسی طرح ہم کو کسی کالج کے قائم کرنے کا ارادہ نہیں کرنا چاہیے جب تک کہ ہم اس قدر سرمایہ بہم نہ پہنچالیں جس سے ہم علاوہ ہندوستانی پروفیسروں کے کم سے کم تین یورپین پروفیسر نہایت عمدہ خصلت کے اور پورے جنٹلمین مقرر نہ کرسکیں''۔[مکمل مجموعہ لکچرز، ص ۳۳۶ تا ۳۳۹]

ایسے اسکول جو انٹرنس تک پڑھاتے ہیں یا پڑھانا چاہتے ہیں اور جن میں ہیڈ ماسٹر ایک یورپین جنٹلمین نہیں ہے، بہت ناقص اسکول ہیں اور طالب علموں کو ناقص رکھتے ہیں، خواہ وہ اسکول گورنمنٹ کے ہوں یا مشنریوں کے یا پرائیویٹ لوگوں کے۔ اگر ہماری قوم ایسے اسکول جاری کرنا چاہتی ہے تو ایسی تدبیر کرے کہ یورپین ہیڈ ماسٹر اس میں ہو اور سمجھ لے کہ بارہ سو روپیہ خرچ کرنا ہوگا۔ جو کالج ایسا ہو جس میں کم از کم تین یورپین پروفیسر نہ ہوں وہ بھی طالب علموں کو، ان کی لیاقت کو ناقص رکھنے والا ہے''۔[مکمل مجموعہ لکچرز، ص ۳۴۱]

قومی سردار اور شرفاء انگریزی پڑھیں: سرسید

ہماری قومی کے سرداروں اور شریفوں کو لازم ہے کہ اپنی اولاد کو انگریزی علوم کی اعلیٰ درجہ تک کی تعلیم دیں''۔[مکمل مجموعہ، ص ۱۸۵]

انگریزی صاحب حیثیت بچوں کو پڑھاؤ: سرسید

بریلی کے مدرسہ انجمن اسلامیہ کی مثال دیتے ہوئے انھوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ ''ایسے مدرسے میں...... انگریزی پڑھانے کا خیال ایک بہت بڑی غلطی ہے'' کیونکہ ''جس حیثیت و درجہ کے یہ لڑکے ہیں ان کو انگریزی پڑھانے سے کوئی فائدہ مترتب نہیں ہونے کا۔ ان کو اسی قدیم طریقۂ تعلیم میں مشغول رکھنا ان کے حق میں اور ملک کے حق میں اور قوم کے حق میں زیادہ تر مفید ہے''۔[مکمل مجموعہ، ص ۱۸۵]

انھوں نے ان کے ''مناسبِ حال'' یہ تجویز کیا کہ ''ان لڑکوں کو کچھ لکھنا پڑھنا اور ضروری کارروائی کے موافق حساب کتاب آ جائے اور ایسے چھوٹے چھوٹے رسالے ان کو پڑھائے جائیں جن سے نماز روزہ کے ضروری ضروری مسائل، جو روزمرہ پیش آتے ہیں اور مسلمانی مذہب کے سیدھے سادے عقائد ان کو معلوم ہو جائیں''۔[مکمل مجموعہ، ص ۱۸۶]

علی گڑھ میں طبقاتی تقسیم: سرسید کی حکمت عملی

یہ حکمتِ عملی جزوی طور پر اس طرح مسلط ہوئی کہ بورڈنگ ہاؤس میں رہائش کے تین درجے مقرر کیے گئے۔ ان درجوں میں باقاعدہ تفریق برتی جاتی تھی جس سے طالب علموں میں بھی طبقاتی احساس موجود رہتا تھا۔ اس کا ایک مظاہرہ میر ولایت حسین نے اپنے دورِ طالب علمی میں ملاحظہ کیا جب ایک بار بورڈنگ ہاؤس کے مینجر نے سیکنڈ کلاس کے ایک بورڈر کو کسی غلطی کی بنا پر تھرڈ کلاس بورڈروں کے ساتھ کھانا کھانے کی سزا سنائی اور جب مذکورہ طالب علم کو اس مقصد کے لیے ڈائننگ ہال میں لایا گیا تو کوئی تھرڈ کلاس بورڈر کھانا کھانے نہ گیا۔[میرے پچاس سال علی گڑھ میں، ص ۵۱]

ادنیٰ خاندانوں کے بچے مفید نہیں: سرسید

''جو ادنیٰ خاندان کے لوگ ہیں وہ ملک یا گورنمنٹ کے لیے مفید نہیں''۔[مکمل مجموعہ، ص ۳۵۱]

ادنیٰ واعلیٰ خاندان کے لوگ برابر نہیں: سرسید

''کیا ہمارے ملک کے رئیس اس کو پسند کریں گے کہ ادنیٰ قوم یا ادنیٰ درجے کا آدمی، خواہ اس نے بی اے کی ڈگری لی ہو یا ایم اے کی، اور گو وہ لائق بھی ہو، ان پر بیٹھ کر حکومت کرے؟ ان کے مال، جائیداد اور عزت پر حاکم ہو؟ کبھی نہیں، کوئی ایک بھی پسند نہیں کرے گا''۔ [مکمل مجموعہ، ص ۳۴۶]

ادنیٰ خاندان کے لوگ حاکم نہیں ہو سکتے: سرسید

''ہندوستان کی شریف قومیں ہندوستان کے ادنیٰ درجہ کے شخص کو، جس کی جڑ بنیاد سے وہ واقف ہیں، اپنی جان و مال پر حاکم ہونا پسند نہیں کریں گے''۔ [مکمل مجموعہ، ص ۳۵۱]

انگریز حاکم خاندانی نہ ہو لیکن ہندوستانی حاکم خاندانی ہو: سرسید

ان کی رائے تھی کہ اعلیٰ سرکاری خدمتوں پر جن ہندوستانیوں کو ملازم رکھا جائے وہ لازماً خاندانی لوگ ہونے چاہئیں۔ ایک مرتبہ ایک انگریز اپنے شریف رشتہ داروں کا ذکر فخریہ کر رہا تھا تو انھوں نے کہا کہ ہمیں اپنے انگریز حاکموں کے خاندانی حالات کا کوئی علم نہیں۔ جب تک ایک انگریز حکومت کی کرسی پر متمکن رہتا ہے ہمارے لیے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا، خواہ وہ کسان کا بیٹا ہو یا کسی امیر لارڈ کا۔ لیکن ہندوستان میں ہم ایک دوسرے کی خاندانی تاریخ سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں اس لیے ہم اسے پسند نہیں کرتے کہ ہمارے سروں پر کسی مجہول النسب شخص کو مسلط کر دیا جائے۔'' [تذکرہ سرسید، ص ۴۲۶]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی: سرسید کی نظر میں

اس جنگ آزادی کے لیے سرسید کے القاب ملاحظہ کیجیے

ہنگامۂ غدر [لائل محمڈنز آف انڈیا (۳)، ص ۱]

ہنگامۂ قتل و غارت [لائل محمڈنز آف انڈیا (۲)، ص ۱۵]

ہنگامۂ مفسدی و بے ایمانی و بے رحمی [لائل محمڈنز آف انڈیا (۲)، ص ۱۳]

سرکشی [سرکشی ضلع بجنور (عنوان)]

ہنگامۂ فساد [سرکشی، ضلع بجنور (عنوان)، ص ۱۴۱]

نمک حرامی [سرکشی، ضلع بجنور (عنوان)، ص ۵]

ہندوستانیوں کی ناشکری کا وبال [سرکشی، ضلع بجنور (عنوان)، ص ۱۴۱]

مجاہدینِ حریت: سرسید کی نظر میں

سرسید نے مجاہدین اور شہداء کے لیے جو القاب استعمال کیے ملاحظہ فرمایئے:

مفسد [سرکشی، ضلع بجنور (عنوان)، ص ۱۰۳]

حرام زادہ [سرکشی، ضلع بجنور (عنوان)، ص ۱۰۳]

نمک حرام [سرکشی، ضلع بجنور (عنوان)، ص ۱۳]

غنیم [سرکشی، ضلع بجنور (عنوان)، ص ۱۳۷]

دشمن [سرکشی، ضلع بجنور (عنوان)، ص ۱۳]

غادر [لال محمڈنز آف انڈیا (۲)، ص ۲۷]

کافر[لال محمڈنز آف انڈیا(۲)،ص۳۰]
بے ایمان[لال محمڈنز آف انڈیا(۲)،ص۳۰]
بذات[لال محمڈنز آف انڈیا(۲)،ص۳۲]
پاجی[اسباب سرکشی ہندوستان،ص۶]
جاہل[اسباب سرکشی ہندوستان،ص۶]
بدرویہ[اسباب سرکشی ہندوستان،ص۷]
بداطوار[اسباب سرکشی ہندوستان،ص۷]
تماش بین[اسباب سرکشی ہندوستان،ص۷]
شراب خور[اسباب سرکشی ہندوستان،ص۷]
افعالِ مجاہدین حریت: سرسید کی نظر میں
جبر[اسباب سرکشی ہندوستان،ص۷]
ظلم[اسباب سرکشی ہندوستان،ص۷]
سرکار کی نمک حرامی، بدخواہی، ناشکری[لال محمڈنز آف انڈیا(۱)،ص۵]
دغا[لال محمڈنز آف انڈیا(۲)،ص۲۳]
بدعہدی[لال محمڈنز آف انڈیا(۲)،ص۲۳]
بلوہ[لال محمڈنز آف انڈیا(۲)،ص۲۷]
بے ایمانی[لال محمڈنز آف انڈیا(۱)،ص۱۳]
بے رحمی[لال محمڈنز آف انڈیا(۱)،ص۱۳]
نعرۂ جہاد: حرام زدگی تھا: سرسید
مفسدوں کی حرمزدگیوں میں سے ایک حرمزدگی[اسباب سرکشی ہندوستان،ص۷]

قائدین جنگِ آزادی:

نواب محمود خان: کم بخت نامحمود خان[۳۲] بذات۔[۳۳] ظالم۔[۳۴]
احمد اللہ خان: بدذات۔[۳۵] بدنیتی اور فساد کا پتلا۔[۳۶]
ماڑے خان: عرف ماڑے بدمعاش۔[۳۷] قدیمی بدمعاش۔[۳۸] پکا بدمعاش۔[۳۹] بے رحم۔[۴۰] مفسد۔[۴۱] حرام زادہ۔[۴۲]
عنایت رسول: نامی باغی۔[۴۳] مشہور حرام زادہ[۴۴]
خان بہادر خان: بدذات۔[۴۵] بے ایمان۔[۴۶] نمک حرام[۴۷]
بہادر خاں (رامپور): بدمعاشوں کا سرکردہ۔[۴۸] بدمعاشوں کا سردار[۴۹]
مولوی وہاج الدین: منونامی بدمعاش۔[۵۰] جاہل۔[۵۱]
اس کے علاوہ جنرل بخت خاں کو ''باغیوں کا سرغنہ'' تحریر کیا۔[۵۲]

''اگر بالفرض گورنمنٹ انگریزی کی جانب سے کچھ دست اندازی بھی ہوتو ان کے حق میں یہ بہتر ہوگا کہ وہ اپنے ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں نہ کہ گورنمنٹ کے مقابلے میں بغاوت اختیار کریں''۔[مکاتب سرسید احمد خان،ص۶۶]

مسلمانوں کا نیشنل لباس پتلون قمیض:

ترک قوم نے نہایت عمدہ اور ہر موقع کے مناسب لباس اختیار کیا ہے جو بہت حالتوں میں موجودہ زمانہ کے مناسب اور قریب قریب اس لباس سے ہے جو ہم پر حکومت کرنے والی قوم کا لباس ہے۔صرف ٹوپی کا فرق ہے۔پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اس کو اپنا نیشنل لباس قرار نہ دیں؟

[بحوالہ تذکرہ سرسید ص ۳۳۵۔۳۳۶]

اسلام میں علوم کی دو اقسام ہیں علوم نقلیہ اور علوم عقلیہ سرسید علوم نقلیہ کی تردید کرتے ہیں اور نقلی علوم کو عقل پر منحصر سمجھتے ہیں۔یہ طرز فکر مغرب میں عقل کو واحد درست ماخذ علم تسلیم کرنے سے پیدا ہوا،سرسید مغربی ماخذ کو اسلامی ماخذ علم پر ترجیح دیتے ہیں۔

عقل کے خلاف آیت کی تاویل کی جائے گی:

تفسیر قرآنی میں سرسید قرآن کے الفاظ کا صحیح مفہوم معین کرنے کے متعلق فرمارہے ہیں کہ:

''ان سب باتوں کے ہونے کے بعد اس بات کا جاننا بھی ضروری ہے کہ جس بات پر متعلق دلیل دلالت کرتی ہے۔اس پر کوئی عقلی معارضہ تو نہیں ہے کیوں کہ اگر کوئی عقلی معارضہ پایا جائے گا تو ضرور نقلی دلیل پر اس کو ترجیح ہوگی اور اس نقلی دلیل کو ضرور دوسرے معنوں میں تاویل کرنا پڑے گا''۔(جلداول،ص۱۱۹)

مطلب یہ ہے کہ قرآن کی کوئی بات عقل کے خلاف معلوم ہوتو لامحالہ اس کی تاویل کرنا چاہیے۔اس کے نتیجے میں تمام معجزات کی سائنسی تاویل کی گئی۔[احمد دین امرتسری نے لکھا مثلاً حضرت موسیٰ کو معلوم تھا کہ پانی کس وقت اترا ہوا تھا لہٰذا وہ نیل سے گزر گئے۔فرعون کو معلوم نہ تھا لہٰذا وہ ڈوب گیا۔یہ معجزہ نہیں تھا بلکہ فرعون سائنس سے واقف نہ تھا۔موسیٰ سائنس سے واقف تھے اس لیے ان کا لشکر بخیر وخوبی نکل گیا،اس میں اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم شامل نہ تھا۔تمام جدیدیت پسند اسی قسم کی سائنسی تعبیر کرتے ہیں۔

نقل کے لیے بھی عقل ہی اصل ہے:

خدا کا قول ہے الرحمان علی العرش استویٰ اس کا مطلب ہے کہ خدا تخت پر بیٹھا ہوا ہے۔''خدا کا تخت پر بیٹھا ہوا ہونا عقلی دلیل سے محال ہے اس لیے اس نقلی دلیل کی غلبہ یا بادشاہت سے تاویل کی گئی،اور اگر یوں نہ کیا جائے تو اجتماع نقضیین یا ارتفاع نقضیین لازم آتا ہے اور اگر دلیل نقلی کو عقل پر ترجیح دیں تو فرع سے اصل بات کا ابطال لازم آتا ہے کیونکہ جو چیزیں نقلی ہیں ان کا اثبات بھی بجز عقل کے اور کسی طرح ممکن نہیں۔پس نقل کے لیے بھی عقل ہی اصل ہے''۔(جلداول،ص۱۱۹)

خوارق عادت اور معجزات سے انکار:

قرآن کے جو قصے سرسید کو عقل کے خلاف محسوس ہوئے ان کی تاویل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مثلاً:ان کے زمانہ میں یہ مسئلہ ثابت نہیں ہوا تھا کہ طوفان نوح کا تمام دنیا میں عام ہونا اور پانی کا اونچے سے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں سے بلند ہوجانا محالات سے ہے اور خلاف واقعہ ہے اور اس لیے ان کے خیال میں یہ بات نہ آئی کہ قرآن میں ''جوالارض'' کا لفظ ہے اس میں الف لام استغراق کا نہیں ہے بلکہ عہد کا ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں کوئی نص صریح اس بات پر نہیں کہ انھیں درحقیقت آگ میں ڈالا گیا تھا۔اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت میں کوئی نص

صریح قرآن میں نہیں ہے کہ وہ فی الحقیقت بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ نہ ہی حضرت یونس علیہ السلام کے قصہ میں ایسی کوئی نص ہے کہ فی الواقعہ ان کو مچھلی نگل گئی اور وہ مچھلی کے پیٹ میں رہے تھے؟ (تفسیر القرآن، دیباچہ: ص ۱۷) یہ نقطہ نظر عقل کے کمالات میں سے ہے جو بات عقل میں نہ آئے وہ غلط ہے۔

سائنسی تفسیر: ہر زمانے میں قرآن کا نیا مفہوم ہوگا

''اور کیا عجب کہ آئندہ زمانہ میں ان علوم کو اور زیادہ ترقی ہو اور جو امور اس وقت تحقیق شدہ معلوم ہوتے ہیں وہ غلط ثابت ہوتے ہوں۔ اس وقت قرآن کریم کے الفاظ کے دوسرے معنی قرار دینے کی ضرورت ہوگی۔ وھلم جرا پس قرآن لوگوں کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہو جائے گا'' (تفسیر القرآن دیباچہ، ص: ۱۹) اس حقیقت کا اعتراف کرنے کے باوجود اس کا حل سرسید کے قلم سے ملاحظہ فرمایے۔

''پس اگر ہمارے علوم کو آئندہ زمانہ میں ایسی ترقی ہو جائے کہ اس وقت کے امور محققہ کی غلطی ثابت ہو تو ہم پھر قرآن مجید پر رجوع کریں گے اور اس کو ضرور حقیقت کے مطابق پائیں گے اور ہم کو معلوم ہوگا کہ جو معنی ہم نے پہلے قرار دیے تھے تو وہ ہمارے علم کا نقصان تھا۔ قرآن مجید ہر ایک نقصان سے بری تھا۔'' (تفسیر القرآن جیبا چہ، ص: ۲۰) [سرسید کے اصول کے تحت قرآن کی آیات وقفے وقفے سے اپنا مطلب تبدیل کرتی رہیں گی، قرآن جدید تحقیق کا ہمیشہ محتاج رہے گا جو کچھ سائنس بتا دے قرآن اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لے۔

''مثلاً فرض کرو کہ قرآن مجید سے ہم نے یہ سمجھا کہ سورج زمین کے گرد پھرتا ہے جس سے طلوع وغروب ہوتا ہے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ سورج ساکن ہے اور زمین سورج کے گرد پھرتی ہے۔ اب ہم قرآن پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سورج کا پھرنا قرآن میں بطور حقیقت کے واقع نہیں ہوا بلکہ (علی مایشہد ہ الناس) بیان ہوا ہے اور وہ سچ ہے پس ہم نے جو اس کو بطور حقیقت واقع کے سمجھا تھا وہ ہماری غلطی تھی نہ کہ قرآن مجید کی'' (تفسیر القرآن دیباچہ، ص: ۲۰) [ا۔ بات انبیاء علیہ السلام کے معجزات کی چل رہی ہے اور سرسید مثال اجرام فلکی سے پیش فرما رہے ہیں۔ قرآن کریم کے الفاظ سے قطعاً یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سورج زمین کے گرد گھوم رہا ہے۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں: (والشمس تجری لمستقرلھا) ''سورج اپنی قرارگاہ پر چل رہا ہے'' (ص: ۳۷/۳۸) اور اس سے مراد اس کی محوری گردش بھی ہو سکتی ہے اور اپنے خاندان سمیت کسی بڑے سیارہ کے گرد گردش بھی سرسید کو بخوبی اندازہ تھا کہ سائنسی تحقیقات میں تبدیلی کے ساتھ ہی ان کی تفسیر مسترد کر دی جائے گی لہٰذا وہ اس کی غلط سلط تاویل پیش فرما کر استرداد کی پیش قدمی کر رہے ہیں۔ علامہ جوہری طنطاوی نے قرآن کریم کی سائنسی تفسیر کئی جلدوں میں کی تھی لیکن یہ تفسیر چند سال میں ہی مسترد ہوگئی کیونکہ سائنس کے بہت سے نظریے بدل گئے اور بہت سے سائنسی امور علامہ طنطاوی سمجھ نہ سکے۔ سائنس کی بنیاد پاپر کے اصول Falcification پر ہے لہٰذا سائنس کا کوئی نظریہ حتمی، قطعی اور آخری نہیں ہوتا یہ سائنس کا دعویٰ ہے۔ افسوس یہ ہے کہ منکرین حدیث فلسفہ اور سائنس کے بنیادی مباحث سے قطعاً ناواقف ہیں اور ٹھوکریں کھاتے ہیں۔]

شبلی: سرسید کے افکار غلط تھے

شبلی کے خیال میں:

''زمانہ جانتا ہے کہ مجھے کو سرسید کے مذہبی مسائل سے سخت اختلاف تھا اور میں ان کے بہت سے عقائد و خیالات کو بالکل غلط سمجھتا تھا''۔ [مقالات شبلی] (۲) ص ۶۴]

سرسید تعلیمِ نسواں کے خلاف تھے:

''سرسید کی یہ بات مشہور ہے کہ انھوں نے تعلیمِ نسواں کے لیے کچھ نہیں کیا اور نہ کرنا چاہتے تھے۔صرف یہی نہیں کہ کرنا نہ چاہتے تھے بلکہ اگر کوئی کچھ کرنا چاہتا تو مانع ہوتے، اس لیے مولوی صاحب کو یہ خوف تھا کہ شاید سید صاحب اس کتاب کو ناپسند کریں گے۔ پھر بھی وہ ان کی خوشی کے بغیر شائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔آخر آپ اس کتاب کو سرسید کی خدمت میں اس غرض سے لے گئے کہ وہ اس پر دیباچہ لکھ دیں۔مولانا شبلی نے اس کتاب کو پڑھ کر کہا کہ سرسید کے پاس یہ کتاب نہ لے جائیے، ناپسند کریں گے۔سید ممتاز علی صاحب نے شبلی کے اس مشورے کا کچھ خیال نہ کر کے سرسید کی خدمت میں وہ کتاب حقوق نسواں پیش کر دی۔مولوی صاحب نے خود ہم سے بیان کیا کہ ''جس وقت میں نے یہ کتاب سرسید کو دکھلائی تو ہم دونوں کے سوا کمرے میں کوئی تیسرا نہ تھا۔اندازاً گیارہ بجے کا وقت تھا۔سب لوگ اپنے اپنے دفتر کو چلے گئے تھے۔میں نے قصداً یہ وقت اس لیے پسند کیا تھا کہ اگر سید صاحب ممدوح غصے بھی ہوں تو کسی دوسرے آدم کی موجودگی میں تو نہ ہوں۔سرسید نے اس کتاب کو کھول کر کہیں سے پڑھا اور چیں بچیں ہوئے۔ پھر کسی دوسری جگہ سے کھول کر پڑھا تو چہرہ سرخ ہوگیا اور جگہ سے کھول کر پڑھا تو چہرہ سرخ ہوگیا اور جب آپ نے اس کا کوئی تیسرا مقام پڑھا تو آپ کے ہاتھ کانپنے لگے۔آخر ضبط نہ کر سکے۔آپ نے کتاب کو بند کر کے لمبائی میں پھاڑ کر اس کتاب کے دو ٹکڑے کر ڈالے اور پھر ایک ٹکڑے کو دوسرے پر رکھ کر اس کے پھر دو ٹکڑے کر ڈالے اور چاروں ٹکڑوں کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا اور آپ نہایت غضب آلود نگاہیں دیوار پر جمائے ایک آدھ منٹ بالکل خاموش بیٹھے رہے۔میں بھی بالکل بے حس وحرکت بیٹھا تھا اور ڈر رہا تھا کہ میری کوئی حرکت ان کی توجہ کو ادھر مائل نہ کر دے۔ [تہذیب نسواں، لاہور، ۶/جولائی ۱۹۳۵ء]

سید ممتاز علی نے اس کتاب کو سرسید کی ناراضگی کے خوف سے ان کی وفات کے بعد شائع کیا۔لیکن اس سے پہلے جب انھوں نے ہندوستان کا سب سے پہلا زنانہ ہفتہ وار اخبار جاری کرنے کا ارادہ کیا تو ان کی اہلیہ نے انھیں اس بارے میں سرسید سے مشورہ لینے کو کہا۔سید ممتاز علی بیان کرتے ہیں:

عورتوں کی تعلیم: سرسید کی نصیحت

تمھیں نصیت کرتا ہوں کہ تم اپنا پرانا طریقۂ تعلیم اختیار کرنے پر کوشش کرو، وہی طریقہ تمہارے لیے دین ودنیا میں بھلائی کا پھل دے گا اور کانٹوں میں پڑنے سے محفوظ رکھے گا''۔

''......میری یہ خواہش نہیں ہے کہ تم ان مقدس کتابوں کے بدلے، جو تمہاری دادیاں اور نانیاں پڑھتی آئی ہیں، اس زمانہ کی مروجہ نامبارک کتابوں کا پڑھنا اختیار کرو جو اس زمانہ میں پھیلتی جاتی ہیں''۔

''........... سچی تعلیم نہایت عمدگی سے ان کتابوں سے حاصل ہوتی ہے جو تمہاری دادیاں نانیاں پڑھتی تھیں۔جیسی وہ اس زمانہ میں مفید تھیں ویسی ہی اس زمانہ میں مفید ہیں''۔[سفرنامہ پنجاب، ص۱۰۱تا۱۰۳]

''ان کی تعلیم میں وہ علوم داخل نہ تھے جن کو اس زمانہ میں یورپ کی تقلید سے لڑکیوں کی تعلیم میں لوگ داخل کرنا چاہتے ہیں۔یورپ کی اور امریکا کی حالت معاشرت کے خیال سے شاید وہ علوم لڑکیوں کو سکھانے ضرور ہوں کیوں کہ ممکن ہے کہ وہاں عورتیں پوسٹ ماسٹرز اور ٹیلی گراف ماسٹرز یا پارلیمنٹ کی ممبر ہوسکیں۔[مکمل مجموعہ لکچرز، ص۳۸۴]

''پچھلی تعلیم کی، جو کسی زمانے میں ہوتی تھیں۔کوئی شریف خاندان کا شخص یہ نہیں خیال کرسکتا کہ وہ اپنی بیٹی کو ایسی تعلیم دے کر ٹیلی گراف آففس میں سگنلر (Signaleer) ہونے کا کام دے یا پوسٹ آفس میں چٹھیوں پر مہر لگایا کرے''۔

[خطباتِ سرسید (۲)، ص ۲۷۹]

''میں پردے کی رسم کا متعدد وجوہ سے نہایت طرف دار ہوں اور بالتخصیص ہندوستان میں''۔ [مہذب لکھنؤ، یکم ستمبر ۱۸۹۰ء، ص ۲]

سرسید اور پردہ! محسن الملک کی گواہی

''سرسید احمد خاں تو جاہل سے جاہل اور کٹر سے کٹر مسلمان سے بھی اس معاملہ میں بڑھ کر تھے۔ججوں، کلکٹروں کی بیویوں نے ان کی بہو یعنی محمود بیگم سے ملنا چاہا لیکن انھوں نے اس کو بھی جائز نہ رکھا''۔ [مجموعہ لکچرز محسن الملک، ص ۴۹۵]

نواب محسن الملک نے اسی بات کو ایک اور موقع پر یوں بیان کیا:

''میں نے تو ان کا یہ حال دیکھا کہ مدت العمر کبھی وہ اس بات کے بھی روادار نہیں ہوئے کہ ان کی بہو محمود بیگم کسی بڑے سے بڑے جلیل القدر انگریز کی میم صاحبہ سے بھی مل سکیں، خواہ وہ ان کے دوستوں کی خاتونیں ہوں یا سید محمود کی۔ یہی ایک بات نہیں بلکہ ان کا تعصب تو اس مسئلہ میں یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ وہ تعلیم نسواں بھی اسی دائرہ کے اندر اندر رکھنا چاہتے تھے جیسا کہ اگلے پرانے شرفا کے خاندانوں کا دستور تھا۔ وہ اس جدید طریقے کی تعلیم کو جس کا چرچا ہو رہا ہے، قوم کے حق میں نہایت مضر خیال کرتے تھے''۔ [مجموعہ لکچرز محسن الملک، ص ۵۱۳]

احرام وحشیانہ لباس:

احرام کے وقت تہ بند باندھنے اور بغیر قطع کیا ہوا کپڑا پہننے کا بھی قرآن مجید میں ذکر نہیں ہے مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ اس کا رواج زمانہ جاہلیت سے برابر چلا آتا تھا اور اسلام میں بھی قائم رہا......محمدؐ رسول اللہ نے شروع سویلیزیشن (Civilization) کے زمانہ میں بھی اسی وحشیانہ صورت اور وحشیانہ لباس کو ہمارے بڑھے دادا کی عبادت کی یادگاری میں قائم رکھا۔ [تفسیر القرآن [۱] ص ۲۴۶-۲۴۷]

مہذب لوگ چھری کانٹے سے کھاتے ہیں:

جو لوگ کہ چمچے اور کانٹوں سے کھاتے ہیں اور ہر دفعہ رکابیاں اور چھری کانٹے چمچے بدلتے جاتے ہیں، جب وہ ہم مسلمانوں کو ہاتھ سے کھاتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ان کو نہایت نفرت اور کراہت آتی ہے۔ [تہذیب الاخلاق [۲] ص ۷۶]

ہاتھ سے کھانے کی سنت کا عقلی انکار:

انصاف سے ہم کو اس بات کا بھی اقرار کرنا چاہیے کہ چھری اور چمچہ سے کھانا اور ہر قسم کے کھانے کے لیے جدا برتنوں کا ہونا بہ نسبت ہاتھ سے کھانا کھانے کے زیادہ عمدگی وصفائی اور نفاست رکھتا ہے۔ [تہذیب الاخلاق [۲] ص ۷۷]

سود حلال ہے:

مذہب اسلام میں جس سود لینے کا امتناع ہے وہ درحقیقت عام اخلاق، عام انسانیت، عام رحم، عام ہمدردی کے برخلاف ہے۔ باقی معاملات تجارت اور دیگر قسم کے لین دین و معاملات میں جو سود ممنوع کا اطلاق کیا گیا ہے یہ علما اور ائمہ مجتہدین کی رائے اور قیاس ہے۔ [علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، یکم دسمبر ۱۸۷۷ء، ص ۱۰۴۲]

قرآن مجید کی فصاحت وبلاغت:

قرآن مجید کی فصاحتِ بے مثل کو معجزہ سمجھنا ایک غلط فہمی ہے، فاتوا بسورة من مثله کا یہ مقصد نہیں ہے۔ [تصنیفِ احمدیہ، حصہ ا جلد ا، ص ۲۱]

میں یہ بھی قبول کرتا ہوں کہ آج تک کسی بشر سے قرآن کے مثل اس کے نہیں کہا گیا مگر اس دلیل کو ایک خام دلیل سمجھتا ہوں اور جو الفاظ قرآن مجید میں اس امر کی نسبت آئے ہیں ان کا یہ مطلب قرار نہیں دیتا ہوں۔ [مکمل مجموعہ لکچرز،ص۲۹۳]

توریت اور انجیل میں تحریف نہیں ہوئی:

میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی کتب مقدسہ میں تحریف لفظی کی ہے اور نہ علمائے متقدمین ومحققین اس بات کے قائل تھے، مگر علمائے متاخرین اس بات کے قائل ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی کتب مقدسہ میں تحریف وتبدیلی کی ہے۔

[تفسیر القرآن[۱]ص۴]

ہم مسلمانوں کے مذہب بموجب اس توریت کے اصلی ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ یہی توریتیں ہمارے جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں مروج تھیں اور باوجودیکہ یہودیوں کو تحریف کا بڑا الزام دیا گیا تھا مگر اس بات کا الزام، کہ یہ توریت اصلی نہیں ہے، کبھی نہیں دیا گیا۔

[تبیین الکلام[۲]ص۱۶]

بعض دیندار علماء مسیحی نے اگر کچھ لفظی تغیر وتبدیلی کی تو وہ بھی وہ تحریف، جس کا قرآن مجید میں ذکر ہے، ہرگز نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ لوگ یقینی جانتے تھے کہ اس کے صحیح اور اصلی اور سچے معنی وہی ہیں جس طرح ہم نے لفظوں کو بدلا ہے حالانکہ قرآن مجید میں جس تحریف کا ذکر ہے وہ ایسی تحریف نہیں ہے بلکہ وہ اس تحریف کا ذکر ہے جس کو وہ لوگ جانتے تھے کہ صحیح اور سچا اور اصلی مطلب یہ نہیں ہے جو ہم بیان کرتے ہیں اور پھر دیدہ ودانستہ اس میں تحریف کرتے تھے اور جان بوجھ کر غلط عبارت پڑھتے تھے یا غلط معنی بیان کرتے تھے۔ [تبیین الکلام،[۱]ص۶۹]

ہر شخص خود مجتہد ہے:

کوئی شخص کسی دوسرے کی رائے اور اجتہاد اور سمجھ کا پابند نہیں ہے...... ہر شخص آپ اپنے لیے مجتہد ہے۔[خطبات احمدیہ، صفحہ۱۸۲]

وحی صرف انبیاء پر نہیں آتی:

مطلق وحی کا آنا صرف انبیاء ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ انبیاء کے سوا مقدس لوگوں پر بھی وحی آتی ہے۔[تبیین الکلام،[۱]ص ۷]

فرشتوں کا وجود نہیں:

جن فرشتوں کا قرآن میں ذکر ہے ان کا کوئی اصلی وجود نہیں ہوسکتا بلکہ خدا کی بے انتہا قوتوں کے ظہور کو اور ان قویٰ کو جو خدا نے اپنی تمام مخلوق میں مختلف قسم کے پیدا کیے ہیں ملک یا ملائکہ کہا ہے۔[تفسیر القران جلد[۱]،ص۴۹]

☆ جبریل، خدا اور پیغمبر میں واسطہ نہیں:

پیغمبر کا دل ہی وہ ایلچی ہوتا ہے جو خدا کے پاس پیغام لے جاتا ہے اور خدا کا پیغام لے کر آتا ہے۔ وہ خود ہی وہ مجسم چیز ہوتا ہے جس میں سے خدا کے کلام کی آوازیں نکلتی ہیں۔ وہ خود ہی وہ کان ہوتا ہے جو خدا کے بے حرف و بے صوت کلام کو سنتا ہے۔ خود اسی کے دل سے فوارہ کی مانند وحی اٹھتی ہے اور خود اسی پر نازل ہوتی ہے۔ اسی کا عکس اس کے دل پر پڑتا ہے جس کو وہ خود ہی الہام کہتا ہے۔ [تفسیر القرآن،ص۲۹]

خدااور پیغمبر میں کوئی واسطہ نہیں ہے۔خود خدا ہی پیغمبر کے دل میں وحی جمع کرتا ہے، وہی پڑھتا ہے، وہی مطلب بتاتا ہے اور یہ سب کام اسی فطری قوت نبوت کے ہیں جو خدا تعالیٰ نے مثل دیگر قویٰ انسانی کے انبیاء میں مقتضائے ان کی فطرت کے پیدا کی ہے، اور وہی قوت ناموس اکبر ہےاور وہی قوت جبریل پیغامبر۔[تفسیر القرآن، [جلد[۱]،ص۳۰]

شیطان کی کوئی اصلیت نہیں:

لفظ شیطان سے اگر کوئی وجود خارج من الانسان مراد لی جائے تو ضرور قرآن مجید کونعوذ باللہ غلط یا خلاف واقعہ ماننا پڑے گا کیونکہ حقیقت میں کوئی وجود خارجی مغوی للانسان موجود نہیں ہے۔[تہذیب الاخلاق،جلد[۲]،ص۲۱۱]

انبیاء کے پاس کوئی معجزہ نہیں ہوتا:

ضمناً یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انبیائے سابقین علیہم السلام کے پاس بھی کوئی معجزہ نہیں تھا اور جن واقعات کو لوگ معجزہ [متعارف معنوں میں] سمجھتے تھے درحقیقت وہ معجزات نہ تھے بلکہ وہ واقعات تھے۔[تفسیر القرآن[۳]ص۲۹]

سچے مذہب میں معجزے نہیں ہوئے:

کوئی مذہب جو سچا ہے اور سچا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اس میں کبھی ایسے عجائبات نہیں ہوتے جو فطرت کے خلاف ہوں، عقل انسانی کے خلاف ہوں اور کوئی سمجھ دار آدمی ان کو تسلیم نہ کرے۔ بلکہ اصلی اور سچا مذہب ایسے عجائبات خلاف فطرت اور خلاف عقل سے بالکل پاک اور خالی ہوتا ہے۔[آخری مضامین ص۲۹]

اسلام معجزوں کا مخالف ہے:

مذہب اسلام اس امر کا جس کو لوگ معجزہ وکرامت کہتے ہیں، سخت مخالف ہے۔قرآن مجید میں بہت سے معجزوں کا ذکر ہے مگر وہ کیا ہیں؟ انسان کا پیدا کرنا، مینہ کا برسانا، اناج کا میووں کا اگانا، سورج چاند ستاروں کا پیدا کرنا، اور یہی درحقیقت معجزے ہیں۔ [مقالات سرسید[۱]ص۱۲۷]

اسلام مغربی علوم کے مقابلے میں ناکام ہے:

جس مجموعہ مسائل واحکام واعتقادات وغیرہ پر فی زمانہ اسلام کا لفظ اطلاق کیا جاتا ہے وہ یقیناً مغربی علوم کے مقابلہ میں قائم نہیں رہ سکتا۔[بروایتِ حالی، حیاتِ جاوید[۱]ص۲۲۵]

میں فرض سمجھتا ہوں کہ جو لوگ لکھے پڑھے ہیں [میں اپنے تئیں لکھے پڑھوں میں نہیں سمجھتا] وہ حال کے علوم جدیدہ کا مقابلہ کریں اور اسلام کی حمایت میں کھڑے ہوں اور مثل علمائے سابق کے یا تو مسائل حکمت جدید کو باطل کردیں یا مسائل اسلام کو ان کے مطابق کردیں کہ اس زمانہ میں صرف یہی صورت حمایت اور حفاظت اسلام کی ہے۔[مقالاتِ سرسید[۱۰]ص۲۵۳]

معتزلہ کے سواسب تفسیریں غلط:

تمام مفسرین کی، سوائے معتزلہ کے یہ عادت ہے کہ اپنی تفسیروں میں محض بے سند اور افواہی روایتوں کو بلاتحقیق لکھتے چلے جاتے ہیں اور ذرا بھی تحقیق کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔[ترقیم ص۲۱]

علماء کی تمام کتابیں بے کار:

تمام کتب مذہبیہ، جو اس زمانہ تک موجود ہیں، ہزاروں غلطیوں سے معمور ہیں۔کوئی ایک کتاب بھی ہمارے ہاتھ میں ایسی نہیں آتی جس میں کوئی نہ کوئی ایسی بڑی غلطی ہمارے سامنے نہ آتی ہو جو اسلام کی سچی اور صحیح حقیقت کو وہمی اور خیالی امر کی طرف مائل نہ کردیتی ہو۔ [بحوالہ مجموعہ لیکچرز محسن الملک ص۳۶۷]

نبوت ختم نہیں ہوئی:

روحانی ترقی یا تہذیب کے باب میں جو کچھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما گئے وہ حد یا انتہا اس کی ہے اور اسی لیے وہ خاتم ہیں۔اب اگر ہزاروں لوگ ایسے پیدا ہوں جن میں ملکہ نبوت ہو مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔رسول خدا صلعم نے ختم نبوت فرمایا ہے مگر نبوت کا ختم اور فیضان الٰہی کا خاتمہ نہیں فرمایا بلکہ ''اولیاء امتی کانبیاء بنی اسرائیل'' کے لفظ سے اس ملکہ نبوت کا تا قیامت جاری رہنا پایا جاتا ہے۔[''تہذیب الاخلاق''،[۲]ص۱۳۲]

☆ابراہیمؑ کو آگ میں نہیں ڈالا گیا:

بے شک ان کے لیے آگ دہکائی گئی تھی اور ڈرایا گیا تھا کہ ان کو آگ میں ڈال کر جلا دیں گے مگر یہ بات کہ درحقیقت وہ آگ میں ڈالے گئے،قرآن مجید سے ثابت نہیں ہے۔[تفسیر القرآن[۸]ص۲۰۶۔۲۰۸]

اگر آگ میں ڈالتے تو ابراہیم جل جاتے:

خدا نے ہم کو قانون فطرت یہ بتایا کہ آگ جلا دینے والی ہے۔پس جب تک یہ قانون فطرت قائم ہے اس کے برخلاف ہونا ایسا ہی ناممکن ہے جیسے کہ قولی وعدہ کے برخلاف ہونا ناممکن ہے۔[تحریر فی اصول التفسیر ص۴۰]

ابرہہ کے لشکر کو چیچک ہوگئی:

قرآن مجید میں جس آفت کا ابرہہ پر نازل ہونا مذکور ہوا ہے اس کی تشبیہیں مرض چیچک سے ایسی مناسبت ہیں کہ اس سے صاف مرض چیچک کی وبا کا ابرہہ کے لشکر میں واقع ہونا پایا جاتا ہے۔[مقالات سرسید[۲]ص۱۲۵]

شق صدر کا واقعہ غلط ہے:

شق صدر کا وقوعہ درست نہیں:[خطبات احمدیہ ص۴۰۰]

شق صدر کے متعلق روایتیں ایسی مختلف ہیں کہ ان کی باہم تطبیق نہیں ہوسکتی اور اس لیے وہ سب کی سب نامعتبر ہیں۔
[خطبات احمدیہ ص۴۰۲]

طوفان نوحؑ سے انکار:

کوئی شخص جو نیچرل سائنس سے واقف ہے،ہرگز یقین نہیں کرسکتا کہ طوفان ساری دنیا میں آیا تھا اور اونچے اونچے پہاڑ، جو دنیا میں ہیں،ان سے بھی پانی اونچا ہوگیا تھا اور ہمارے نزدیک قرآن مجید سے ہرگز یہ بات ثابت نہیں ہے کہ تمام دنیا میں طوفان آیا تھا۔[مقالات سرسید[۲]ص۴۷]

لا مذہب بھی مسلمان ہے:

اسلام ایک سیدھا سادا بے کھٹ وسیع مذہب ہے کہ لامذہبی بھی، جو لوگوں نے اپنے خیال میں سمجھ رکھی ہے، درحقیقت اسلام ہی کا ایک نام ہے۔پس لامذہب بھی کوئی مذہب رکھتا ہوگا اور وہی اسلام ہے۔[مقالات سرسید[۳]ص۱۷]

سمت قبلہ کی اہمیت لازمی نہیں:نماز ہو جاتی ہے

نماز کے لیے کسی طرف منہ کرنا اور سمت قبلہ ٹھہرانا اسلام کے اصلی اور لازمی احکام سے نہیں ہے۔[تفسیر القرآن[۸]ص ۲۰۵]

عیسیٰؑ کے نام کا کھانا بھی جائز ہے:

بعض روایتوں میں آیا ہے کہ اہل کتاب حضرت مسیحؑ کا نام لے کر ذبح کریں تو بھی اس کا کھانا درست ہے۔[احکام

طعام،ص۱۷]

اہل کتاب کا گردن توڑ سر پھاڑ کر مارا جانور حلال ہے:

اگر اہل کتاب کسی جانور کی گردن توڑ کر مار ڈالنا یا سر پھاڑ کر مار ڈالنا زکوٰۃ سمجھتے ہوں تو بھی اسی کا کھانا درست ہے۔

[احکام طعام،ص۱۷]

میں نے اہل کتاب کی گردن مروڑی ہوئی مرغی کبوتر کھایا:

ہم نے انگریزوں کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا یا گردن مروڑی ہوئی مرغی وکبوتر کھایا۔ یہ امر اضطراری نہ تھا بلکہ اختیاری تھا۔ پس ہمارے مسلمان بھائی متعصب [نہیں نہیں، اہل تقویٰ و ورع] اگر اس کو ناجائز سمجھتے ہیں تو ان کو اختیار ہے کہ اس کو نہ کھائیں۔

[مسافران لندن،ص۱۶۱]

سفید داڑھی منڈانے کے قابل ہو جاتی ہے:

داڑھی...... بشرطیکہ وحشیانہ پن سے نہ رکھی جائے، تہذیب کے برخلاف نہیں ہے۔ چنانچہ ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں اشخاص جو نہایت مہذب قوم کے ہیں، داڑھی رکھتے ہیں اور ہمارے ملک کے بھی خوب صورت گورے رنگ کے چہروں پر، بشرطیکہ گورا رنگ ہو، کالی ڈاڑھی نہایت خوبصورت اور بھلی معلوم ہوتی ہے [ہاں جب سفید ہو جائے تو منڈانے کے قابل ہو جاتی ہے بشرطیکہ منہ کی جھریاں اور گالوں کے گڑھے اور منہ کا پوپلا پن صورت کو بدنما نہ کردے] اس کے سوا منہ کی رونق اور شجاعت و بہادری و رعب اس سے پایا جاتا ہے۔ اگر داڑھی منڈانی ناجائز ہو تو اس سے ہمارا کچھ حرج نہیں، اگر جائز ہو تو ہمارا کچھ حرج نہیں۔ [تہذیب الاخلاق[۲]ص۲۹۴]

داڑھی کا اطلاق جیسا کل داڑھی پر ہے ویسا ہی جز و داڑھی پر ہے۔ اگر داڑھی کا منڈانا ناجائز ہے تو اس کے جزو کا بھی ناجائز ہے۔ اگر کوئی شخص ایک طرف کی داڑھی منڈائے اور ایک طرف کی رہنے دے یا بیچ میں سے منڈائے اور دونوں طرف گل مچھے رہنے دے وہ بھی ایسی ہی ناجائز ہوگی جیسے کہ کل داڑھی کا منڈانا۔ [تہذیب الاخلاق[۲]ص۳۹۵]

اسلام اور مغرب کی علمیات میں بنیادی نوعیت کا فرق ہے۔ اسلام میں علوم کی تقسیم [۱] علوم نقلیہ [۲] علوم عقلیہ ہے جب کہ مغرب میں علوم کی تقسیم سائنس اور آرٹس اور مزید سائنس کی دو شاخیں نیچرل سائنس اور سوشل سائنسز ہیں۔ اسلام میں علم کا اصل سرچشمہ وحی الٰہی ہے جب کہ مغرب میں علم کا سرچشمہ عقل اور حواس ہے جو تجربے کے ذریعے اپنا اظہار کرتے ہیں۔ سرسید نے مغرب کی عقلیت کو قبول کر لیا تھا۔ یہ بات واضح رہے کہ سرسید انگریزی زبان سے ناواقف تھے۔ وہ مغربی فکر و فلسفے بھی واقف نہ تھے، وہ صرف مغرب کی چکا چوند سے بے حد متاثر تھے۔ برطانیہ میں اپنے گھر کی خادمہ سے وہ اتنے متاثر تھے کہ اس کے بارے میں انھوں نے لکھا ''ہندوستان کے اعلیٰ سے اعلیٰ خاندان کی عورت بھی اتنی مہذب و شائستہ نہ ہوگی''۔ چھری کانٹے، میز کرسی پر انگریزوں کو کھانا کھاتے ہوئے دیکھ کر سرسید کو دسترخوان، ہاتھ سے کھانا نہایت حقیر اور ذلیل رویہ محسوس ہوا۔ لہٰذا اس رویے کی جگہ جگہ مذمت فرمائی، جس سے ان کی ذہنی مرعوبیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے باعث وہ تمام مذہبی معاملات کو عقل کی کسوٹی پر لے جاتے پھر یا تو مسترد کر دیتے یا اس کی عجیب و غریب مضحکہ خیز تاویلیں کرتے۔ سرسید کی یہ جدیدیت عالم اسلام کے تمام جدیدیت پسندوں کا سرمۂ نظر ہے۔ اس جدیدیت کو ان کے قریبی رفقاء ڈپٹی نذیر احمد، محسن الملک، شبلی اور حالی نے بھی قبول نہ کیا۔ نذیر احمد نے اپنے ناول ''ابن الوقت'' میں اشاروں و کنایوں میں بہت کچھ کہہ دیا۔ نذیر احمد نے سرسید کی تفسیر پر جو فحش تبصرہ کیا وہ لائق مطالعہ چیز ہے۔ سرسید کے نقطۂ نظر کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ تمام آراء ان کی ذاتی آراء ہیں جس کی تاریخ یا تحقیق سے کوئی دلیل نہیں دی گئی۔ بنیادی طور پر وہ صحافی تھے لہٰذا ان کی تفسیری آراء مضحکہ خیز صحافیانہ تبصروں کے سوا کچھ نہیں۔ اس کے چند

نمونے ملاحظہ فرمایے:

مسلمانوں کا نیشنل لباس پتلون قمیض:

ترک قوم نے نہایت عمدہ اور ہر موقع کے مناسب لباس اختیار کیا ہے جو بہت حالتوں میں موجودہ زمانہ کے مناسب اور قریب قریب اس لباس سے ہے جو ہم پر حکومت کرنے والی قوم کا لباس ہے۔صرف ٹوپی کا فرق ہے۔پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اس کو اپنا نیشنل لباس قرار نہ دیں؟

[بحوالہ تذکرہ سرسید ص ۳۳۵۔۳۳۶]

جن الگ مخلوق نہیں انسان ہیں:

جہاں جن کے لفظ کا فی الواقع ایک مخلوق مستقل پر اطلاق ہوا ہے اس سے جنگی اور وحشی انسان مراد ہیں جو پوری پوری تمدنی حالت میں نہیں ہیں۔[تفسیر القرآن[۵]ص ۱۶۵]

حضرت سلیمانؑ اور جن:

ان وحشی اور جنگلی اور پہاڑی آدمیوں پر جو حضرت سلیمانؑ کی سرکار میں عمارت کے لیے پہاڑ سے پتھر لاتے اور جنگلوں سے لکڑی کاٹنے کا کام کرتے تھے،قرآن مجید میں جن کا اطلاق ہوا ہے۔[تفسیر القرآن[۵]ص ۱۶۷]

جب حضرت سلیمانؑ نے بلقیس کے لیے تخت منگانا چاہا،ایک زبردست پہاڑی آدمی نے کہا ’’میں ابھی اٹھالاتا ہوں‘‘۔ یہ جو مفسرین نے قصہ بنایا ہے کہ وہ تخت شہر سبا یعنی ملک یمن میں تھا، نہ اس کی کچھ اصلیت ہے نہ اس کا کچھ ثبوت ہے۔سلیمانؑ کے مکان میں وہ تخت ہوگا انھوں نے اس کو منگانا چاہا۔ایک شخص نے کہا ’’حضور، میں ابھی اٹھالاتا ہوں‘‘۔اس میں نہ کچھ عجیب قصہ ہے نہ کوئی بات ہے مگر ہاں،واعظین کے لیے منبر پر بیٹھ کر عجیب وغریب دوراز کار اور دور از عقل باتیں بنانے کو کافی نہیں۔[تفسیر الجن،ص ۳۰]

سرسید کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ زبردست پہاڑی آدمی تھا اور یہ کہ وہ تخت ملکہ سبا کا نہیں حضرت سلیمانؑ کا تھا۔

کسی کے پاس کرامت نہیں ہوتی:

ہماری سمجھ میں کسی شخص میں معجزے یا کرامت کے ہونے کا یقین کرنا ذاتِ باری کی توحید فی الصفات پر ایمان کو ناقص اور نامکمل کر دینا ہے۔[تفسیر القران[۳]ص ۳۸]

قرآن مجید کے سادہ معنی لیے جائیں:

خدا نے ان پڑھ بدوؤں کے لیے ان ہی کی زبان میں قرآن اتارا ہے۔پس ہمیشہ قرآن مجید کے سیدھے سیدھے صاف صاف معنی لینے چاہئیں اور نکات بعد الوقوع اور کنایات واشارات واستعارات ودلالات کی قسم کو اس میں گھسیڑ کر اس کو کھینچنا اور تاننا نہیں چاہیے۔[تہذیب الاخلاق[۲]ص ۲۳۸]

معتزلہ کے سوا سب تفسیریں غلط:

تمام مفسرین کی،سوائے معتزلہ کے یہ عادت ہے کہ اپنی تفسیروں میں محض بے سند اور افواہی روایتوں کو بلاتحقیق لکھتے چلے جاتے ہیں اور ذرا بھی تحقیق کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔[ترقیم ص ۲۱]

تقلید نے اسلام کو تباہ کر دیا:

یہ بات سچ ہے کہ ہم کو متعدد مسائل میں مسلمانوں سے اختلاف ہے۔ہم تقلید کو تسلیم نہیں کرتے، مذہب کو تقلیداً قبول کرنے سے تحقیقاً اس پر ایمان لانا بہتر جانتے ہیں اور اسی طرح اور بہت سے مسائل اعتقادی وتمدنی ہیں جن سے یا جن کے طرز بیان و

طریقہ استدلال سے ہم کو اختلاف ہے۔[مقالات سرسید[۱۰]صفحہ ۲۰۷]

جس قدر نقصان اسلام کو تقلید نے پہنچایا ہے اتنا کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔ سچے اسلام کے حق میں تقلید سنکھیا سے بھی زیادہ زہر قاتل ہے۔ بلاشبہ ہم نے علماء کو مثل یہود و نصاریٰ کے ارباباً من دون اللہ سمجھ لیا ہے۔[خطوط سرسید،ص۱۰۰]

اہلِ حدیث بھی مقلد ہیں:

اس زمانہ میں ایک فرقہ ہے جو اپنے تئیں اہل حدیث کہتا ہے اور اس کے مخالف اس کو وہابی کہتے ہیں۔ وہ فرقہ تقلید کا منکر اور عمل بالحدیث کا قائل ہے مگر وہ بھی تقلید میں پھنسا ہوا ہے۔ اور جس قدر لوگوں کی مقلدین ائمہ مجتہدین تقلید کرتے ہیں اس سے بہت زیادہ لوگوں اور راویوں کی یہ فرقہ تقلید کرتا ہے۔[آخری مضامین،صفحہ ۱۷]

وہابیت پروٹسٹنٹ ازم:

میری دانست میں جو نسبت مذہب پروٹسٹنٹ والے کو رومن کیتھولک کے ساتھ ہے وہی نسبت ایک وہابی کو اسلام کے اور فرقوں کے ساتھ ہے۔[ریویوڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر،ص ۷]

وہابی پکے اور سچے:

وہابی اپنے مذہب میں بڑے پکے اور نہایت سچے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اصول سے کسی حال میں منحرف نہیں ہوتے۔[ریویوڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر،ص۲۸]

نیچری ــــــ ایک طعنہ مگر مذہب خدائی:

جتنے پیغمبر گزرے ہیں سب نیچری تھے۔ خدا خود نیچری ہے۔ جب لوگوں نے نیچر کے قوانین کو چھوڑا تب ہی اس نے پیغمبر بھیجا۔ جو پیغمبر آیا اس نے کیا کیا؟ پھر لوگوں کو نیچر کا رستہ بتایا اور جتنا بگاڑا تھا اتنے کو پھر سنوارا۔ جب موسیٰ سے نیچرلسٹ (Naturalist) کو لوگوں نے مجنوں کہا تو پھر ہم کس گنتی میں ہیں؟ ہم کو جو چاہیں کہیں۔[مقالات سرسید[۱۵]،ص۱۵۲]

نبوت الہام انسانی صلاحیت ہے:

میں ملکہ نبوت والہام کو بھی ایک قوت انسانی کے قویٰ میں سے سمجھتا ہوں مگر...... ہر ایک انسان میں اس ملکہ کا ہونا ضروری نہیں ہے۔[''مقالاتِ سرسید''[۱۳]ص۳۹۹]

اللہ اور فرشتوں کی گفتگو بھٹیاروں کی تو تو میں میں تھی:

فرشتے خدا سے مباحثہ نہیں کر سکتے بلکہ اس کے حکم کو بجالاتے ہیں...... پھر کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ فی الواقع فرشتوں نے خدا سے مباحثہ یا جھگڑا ٹنٹا کیا تھا۔[تفسیر القرآن[۱]ص۵۲]

اگر ان الفاظ کے وہی معنی ہوں تو خدا میں اور فرشتوں میں خدائی اور بندگی کاہے کو ہوئی، بھٹیاروں کی تو تو میں میں ہوئی۔ اگر یہ سچ ہو تو ہم کو اپنے نوکروں کی بھی شکایت نہیں رہے کیونکہ خدا کے نوکر ہمارے نوکروں سے بھی زیادہ ٹرے ہیں۔ اس تمام قصہ سے اگر وہی معنی مراد ہوں تو خدا کے علو مرتبہ اور تقدس اور تنزیہ میں بٹا لگتا ہے۔[تہذیب الاخلاق[۲]ص۲۱۳]

حضرت عیسیٰ کے باپ یوسفؑ تھے:

حضرت عیسیٰ اپنے باپ یوسف کے تخم سے پیدا ہوئے ہیں۔

[تفسیر القرآن[۲]ص۳۰-۳۱]

حضرت مریمؑ شادی شدہ تھیں:

[۲] کیا عجب ہے کہ خواب کے بعد ہی حضرت مریمؑ کو اور ان کے مربیوں کو حضرت مریمؑ کی شادی کا خیال پیدا ہوا ہو جو آخر کار یوسف کے ساتھ عقد ہونے سے پورا ہوا [تفسیر القرآن [۲] ص ۳۲-۳۳]

حضرت مریمؑ کے شوہر یوسف تھے:

حضرت مریمؑ ...... حسب قانون فطرت انسانی اپنے شوہر یوسف سے حاملہ ہوئیں۔ [تفسیر القرآن [۲] ص ۳۶]

حضرت عیسیٰؑ نے گھوارے میں کلام نہیں کیا:

مہد میں کلام: قرآن مجید سے ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عیسیٰؑ نے ایسی عمر میں جس میں حسبِ فطرت انسانی کوئی بچہ کلام نہیں کرتا، کلام کیا تھا۔ [تفسیر القرآن [۲] ص ۳۷]

عیسیٰؑ کے معجزے، معجزے نہیں:

مٹی کے پرندوں میں جان ڈالنے کا عمل: [تفسیر القرآن [۲] ص ۲۳۵]

[تفسیر القرآن [۲] ص ۲۳۸-۲۴۰]

اندھوں اور کوڑھیوں کی صحت یابی: [تفسیر القرآن [۲] ص ۲۴۴] معجزہ نہیں۔

مُردوں کا احیاء معجزہ نہیں۔ [تفسیر القرآن [۲] ص ۲۴۷]

حضرت عیسیٰؑ طبعی موت سے مرے:

حضرت عیسیٰؑ کو یہودیوں نے نہ سنگ سار کر کے قتل کیا، نہ صلیب پر قتل کیا بلکہ وہ اپنی موت سے مرے اور خدا نے ان کے درجہ اور مرتبہ کو مرتفع کیا۔ [تفسیر القرآن [۲] ص ۴۸]

ذبیح اللہ اسمٰعیلؑ نہیں اسحاقؑ تھے:

ذی علم مسلمان عالموں کا صاف بیان ہے کہ حضرت اسحٰقؑ کی نسبت قربانی کا حکم ہوا تھا، نہ کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی نسبت۔

[خطبات احمدیہ، ص ۹۰]

ابراہیمؑ نے بی بی ہاجرہ اور اسمٰعیلؑ کو گھر سے نکال دیا:

اصل واقعہ صرف اتنا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی پہلی بی بی سارہ کے کہنے سے اپنی دوسری بی بی ہاجرہ اور ان کے بیٹے اسمٰعیلؑ کو جو ہوشیار اور بڑے ہو گئے تھے، گھر سے نکال دیا۔ [خطبات احمدیہ ص ۷۲]

حضرت یوسفؑ کی قمیض کے اوصاف معجزہ نہیں [تفسیر القرآن [۵] ص ۱۱۴]

ہاروت و ماروت آدمی تھے:

یہ دونوں فرشتے نہیں، بلکہ آدمی تھے۔ [تفسیر القرآن [۱] ص ۵۸-۵۹]

بدر میں فرشتے نازل نہیں ہوئے:

بدر کی لڑائی میں فرشتوں کی آمد نہیں ہوئی: [تفسیر القرآن [۴] ص ۱۴]

عذاب الٰہی کی ماہیت کا انکار:

اگرچہ توریت میں اور دیگر صحف انبیاء میں ارضی و سماوی واقعات کا سبب انسانوں کے گناہ قرار دیئے ہیں جو مثل ایک پوشیدہ بھید کے سمجھ سے خارج ہے۔ مگر قرآن مجید میں بھی ایسے واقعات کو انسانوں کے گناہوں سے منسوب کرنا بلاشبہ تعجب سے خالی نہیں۔

[تفسیر القرآن[۳]ص ۱۹۰]

جنت ودوزخ کی حقیقت:

انبیاء نے راحتوں اور لذتوں یا رنج اور تکلیفوں کو جو انسان کے خیال میں ایسی ہیں جوان سے زیادہ نہیں ہوسکتیں، بطور جزاء وسزا ان افعال کے بیان کیا ہے اور غرض ان سے بعینہ وہی اشیاء نہیں ہیں۔[تفسیر القرآن[۱]ص ۳۷]

ترکِ صلوٰۃ گناہ کبیرہ نہیں:

میری سمجھ میں نماز پڑھنے کا صرف گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے۔[خطوط سرسید، ص ۱۰۹]

سرسید مامور من اللہ تھے:

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ مامور من اللہ انسان دوسرے کی بات مان لینے میں مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ تعجب ہے کہ آپ نے مجھ کو مامور من اللہ نہیں سمجھا۔ حضرت! جو شخص جو کچھ کرتا ہے وہ اس کام کے لیے مامور من اللہ ہوتا ہے۔ پس مامور من اللہ کو مامور من اللہ کی عرض قبول کرنا ضروری ہوتا ہے اس لیے مجھے یقین ہے کہ حضرت مہدی زماں مسیح الوقت امام مامور من اللہ میری درخواست کو ہرگز رد نہ فرمائیں گے۔[مکتوباتِ سرسید، جلد دوم ص ۲۱٦]

سود لینا جائز ہے:

ان کے سوا وہ لوگ ہیں جو ذی مقدور اور صاحب دولت و جاہ وحشمت ہیں اور اپنے عیش اور آرام کے لیے روپیہ قرض لیتے ہیں، جائدادیں مول لیتے ہیں، مکان بناتے ہیں اور قرض روپیہ لے کر چین اڑاتے ہیں گوان کو قرض دینا بعض حالتوں میں خلاف اخلاق ہو مگر ان سے سود لینے کی حرمت کی کوئی وجہ قرآن مجید کی رو سے مجھ کو نہیں معلوم ہوتی۔[تفسیر القرآن[۱]ص ۳۰۷]

مدرسۃ العلوم کے قیام سے سرسید کے اخلاق بگڑ گئے:

''مگر جب سے انھوں نے مدرسۃ العلوم قائم کیا ان کا حال بالکل اس کے برخلاف تھا وہ سائل کو کبھی اپنے دروازے پر پھٹکنے نہ دیتے تھے......جس درشتی اور سختی کے ساتھ وہ سائل کو جھڑکتے اور اس پر دوردبک کرتے تھے اس کو دیکھ کر ناواقف آدمی ان کو سخت بداخلاق اور بدمزاج تصور کرتا تھا۔[حیاتِ جاوید حصہ دوم، ص ۵۰٦]

حکمرانوں کی زبان سیکھنا ضروری ہے:

تاریخ میں کوئی نظیر اس بات کی نہیں پائی جاتی کہ کسی ایسی زبان کی وساطت سے جو حکمران قوم کی زبان نہ ہو، کسی قوم میں کسی علم نے ترقی پائی ہو۔[بحوالہ حیات جاوید[۱]ص ۲۴۷]

انگریز ہیڈ ماسٹر کے بغیر اسکول بے فائدہ ہیں:

ہم کو کسی اسکول کے قائم کرنے کا ارادہ نہیں [کرنا] چاہیے جب تک کہ ہم انٹرنس کلاس کی پڑھائی کا اسکول نہیں قائم کرسکتے اور جس میں ایک نہایت عمدہ اور لائق پورا جنٹلمین یورپین ہیڈ ماسٹر مقرر نہیں کرسکتے......اس درجہ سے کم تر درجہ کا اسکول قائم کرکے بچوں کو اس میں پھنسانا قومی نقصان کا باعث ہے۔[مکمل مجموعہ لیکچرز، ص ۳۳۸]

غریب لڑکوں پر مشتمل مدرسوں میں انگریزی تعلیم دینے کا غلط خیال:

ہماری قوم کے سرداروں اور شریفوں کو لازم ہے کہ اپنی اولاد کو انگریزی علوم کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم دیں۔ مجھ سے زیادہ کوئی شخص نہ نکلے گا جو مسلمانوں میں انگریزی علوم کی ترقی دینے کا حامی اور خواہش مند ہو۔ جس حیثیت و درجہ کے یہ لڑکے ہیں ان کو انگریزی پڑھانے سے کوئی فائدہ مترتب نہیں ہونے کا۔ ان کو اسی قدیم طریقہ عام تعلیم میں مشغول رکھنا ان کے حق میں اور ملک کے حق میں اور قوم

کے حق میں زیادہ تر مفید ہے۔مناسب حال یہ ہے کہ ان لڑکوں کو کچھ لکھنا پڑھنا اور ضروری کارروائی کے موافق حساب کتاب آ جائے اور ایسے چھوٹے چھوٹے رسالے ان کو پڑھائے جائیں جن سے نماز روزہ کے ضروری ضروری مسائل، جو روزمرہ پیش آتے ہیں اور مسلمانی مذہب کے سیدھے سادے عقائد ان کو معلوم ہو جائیں۔[مکمل مجموعہ لیکچرز،۱۸۵۔۱۸۶]

یونیورسٹی کی تعلیم خچر بناتی ہے:

ہماری پوری تعلیم اس وقت ہوگی جب کہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی، یونیورسٹیوں کی غلامی سے ہم کو آزادی ہوگی، ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے اور بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں علوم پھیلا دیں گے۔فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں میں اور کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر۔یونیورسٹی کی تعلیم ہم کو صرف خچر بناتی ہے۔[خطبات سرسید [۲]ص۲۷۶]

انگریزی مدرسے مذہبی بداعتقادی پھیلاتے ہیں:

کوئی نوجوان، خواہ ہندو خواہ مسلمان، ایسا نہیں ہے جو ہمارے انگریزی مدرسوں میں تعلیم پائے اور اپنے بزرگوں کے مذہب سے بداعتقاد ہونا نہ سیکھے۔ایشیا کے شاداب اور تروتازہ مذہب جب مغربی [یعنی انگریزی] علوم کی سچائی کے قریب آتے ہیں جو مثل برف کے ہے، تو سوکھ کر لکڑی ہو جاتے ہیں۔آمنا وصدقنا، یہ قول ڈاکٹر ہنٹر صاحب کا بالکل سچ اور بتمامہ سچ ہے۔[تہذیب الاخلاق [۲]ص۱۹۲۔۱۹۳]

مذہبی کتابوں کا نہ پڑھنا ان کے پڑھنے سے ہزار درجہ بہتر ہے:

بڑے بڑے معمم و مشمل قدوس عالموں نے بہت غور کے بعد یہ تجویز کی کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم بھی دی جائے اور کتب درسیہ عقائد اور فقہ و اصول و تفسیر و حدیث و علم کلام بھی انگریزی کے ساتھ پڑھائی جائیں تاکہ عقائد مذہبی پختہ و درست رہیں اور علوم غربیہ کے ریلے میں بہہ نہ جائیں مگر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ کتب درسیہ مذہبیہ تو لا مذہبی کا علاج کر نہیں سکتیں بلکہ اگر یہ کتابیں انگریزی تعلیم اور مغربی علوم کے ساتھ پڑھائی جائیں گی تو اور زیادہ لا مذہبی اور بداعتقادی پھیلے گی اس لیے کہ سوائے قرآن مجید کے جس قدر کتب مذہبیہ اس زمانہ تک موجود ہیں ہزاروں غلطیوں سے معمور ہیں۔

ایسی حالت میں ان کتابوں کا نہ پڑھنا ان کے پڑھنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔مسلمان ہونے اور بہشت میں جانے کو خدا کو ایک و پیغمبر کو برحق جاننا کافی ہے، عمل کو نماز پڑھ لینی اور روزہ رکھ لینا بس ہے، ان غیر مفید کتابوں کے پڑھنے سے کیا حاصل ہے؟ [تہذیب الاخلاق [۲]ص۱۹۲۔۱۹۴]

اسلامی سزائیں وحشیانہ ہیں:

تمام خلق اللہ کو امن دینے کے لیے بالاضطرار سزائے بدنی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔گو کہ وہ ایک وحشیانہ سزا ہو مگر مجبوری اختیار کی جاتی ہے۔نہایت شائستہ ملکوں میں بھی بحالت مجبوری سزائے بدنی دی جاتی ہے۔بید کی سزا بھی ایسی ہی وحشیانہ ہے مگر قید خانے اس قدر کثیر مجرموں کے قید کرنے کو کافی نہیں ہوتے تو بجبوری سزائے بدنی دے کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔پس قرآن مجید نے اور نیز حضرت موسیٰؑ نے مجبوری کی حالت میں اس سزائے بدنی کو جائز رکھا ہے۔مگر جب ملک میں تسلط ہو اور قید خانوں کا انتظام موجود ہو تو قرآن مجید کی رو سے اس سزائے بدنی کا دینا کسی طرح جائز نہیں ہے۔[تفسیر القرآن [۲]ص۲۰۲]

چوری کی سزا قطع ید نہیں:

سرقہ محض میں سارق کا ہاتھ کاٹا جائے گا جب کہ ملک و قوم کی حالت ایسی ہو کہ قید خانوں کا انتظام نہ ہو۔یا قید خانہ میں قید

کیا جائے گا جب کہ وہ موجود ہوں۔[تفسیر القرآن [۲] ص۲۰۴۔۲۰۵]

اسلام میں دیت جائز نہیں:

یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اسلام میں بھی قتل عمد کا معاف کر دینا یا دیت کا لینا جائز کر دیا گیا ہے۔[تفسیر القرآن [۱] ص ۲۱۱۔۲۱۴]

حضرت عثمانؓ نے سب غارت کر دیا [نعوذ باللہ]

حضرت عثمانؓ نے سب چیزوں کو غارت کر دیا۔حضرت ابوبکرؓ تو صرف برائے نام بزرگ آدمی ہے۔پس میری رائے میں ان بزرگوں کی نسبت کچھ لکھنا اور مورخانہ تحریرات کا زیر مشق بنانا نہایت نامناسب ہے۔جو ہوا سو ہوا، جو گزرا سو گزرا۔[نعوذ باللہ][خطوط سرسید، ص۱۸۳]

ہندو مسلمان ایک قوم ہیں:

لفظ ''قوم'' سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔یہی وہ معنی ہیں جس میں میں لفظ ''نیشن'' [قوم] کی تعبیر کرتا ہوں۔میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے لائق نہیں ہے کہ ان کا مذہبی عقیدہ کیا ہے۔[سفرنامہ پنجاب ص۱۶۷]

ہندو مذہبی نام نہیں ہے ہر ہندوستانی ہندو ہے:

ہندو میری رائے میں کسی مذہب کا نام نہیں بلکہ ہر ایک شخص ہندوستان کا رہنے والا اپنے تئیں ہندو کہہ سکتا ہے۔[سفرنامہ پنجاب ص۱۳۹]

جس کی چل گئی وہی خلیفہ:

رہ گئی خلافت فی ابقائے اصلاح امت و اصلاح تمدن، اس کا ہر کسی کو استحقاق تھا، جس کی چل گئی وہی خلیفہ ہو گیا۔ [تصانیف احمدیہ، حصہ ۱، جلد ۱، ص۳۷]

جنت ودوزخ قرآن سے ثابت نہیں:

پس یہ مسئلہ کہ بہشت اور دوزخ دونوں بالفعل مخلوق و موجود ہیں، قرآن سے ثابت نہیں۔[تفسیر القرآن [۱] ص ۳۶]

چین امریکہ افریقہ میں بھی پیغمبر آئے ہیں:

جو لوگ کہ پیغمبروں کی راہ پر ہیں وہ ضرور نجات پائیں گے خواہ وہ پیغمبر چین کا ہو یا ماچین کا، عرب کا ہو یا فلسطین کا، امریکہ کا ہو یا افریقہ کا، ہندوستان کا ہو یا فارستان کا، مہذب لوگوں کا ہو یا وحشیوں کا۔[مقالات سرسید [۴] ص۲۷۰]

محمدی وہ ہے جو احد کو مانتا ہے احمدؐ کو نہیں مانتا:

وہ شخص جو نہ کسی نبی کو مانتا ہو، نہ کسی اوتار کو، نہ کسی کتاب الہامی کو اور نہ کسی حکم کو جو مذاہب میں فرض وواجب سے تعبیر کیے گئے ہیں اور صرف خدائے واحد پر یقین رکھتا ہو، کون ہے؟ مسلمان............،اس کا محمدی ہونا ایسا لازم ہے جیسے کہ اس کا مسلمان ہونا۔ پس وہ بھی درحقیقت محمدی ہے۔[مقالاتِ سرسید [۳] ص۱۷]

جوتے سے نماز سنت ہے:

جوتا پہن کر نماز پڑھنی سنت ہے اور اس پر نجس ہونے کا گمان کرنا وسواس میں داخل ہے۔[تہذیب الاخلاق [۲] ص۲۳۰]

حجر اسود کا بوسہ:

یہ پتھر جو کعبہ کے کونہ میں لگایا گیا تھا اس سے مقصود اس پتھر کی پرستش نہ تھی بلکہ صرف اس لیے لگایا گیا تھا کہ کعبہ کے طواف شروع ہونے اور ختم ہونے کی نشانی ہو۔[خطباتِ احمدیہ،ص۳۱۳]

شراب سب پیتے تھے:

شراب کی حرمت جب تک نہ ہوئی تھی، تمام انبیاء سابقین اور اکثر صحابہ اس کے مرتکب ہوئے۔[تہذیب الاخلاق[۲] ص۳۱۹]

حقیقی بہن سے انبیاء سابقین کا نکاح:

ایک زمانہ میں حقیقی بہن سے نکاح منع نہ تھا اور بعض نبی انبیاء سابقین میں سے اس کے مرتکب ہوئے۔اسی طرح حقیقی دو بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرنا منع نہ تھا، متعدد انبیاء اس فعل کے مرتکب ہوئے۔[تہذیب الاخلاق[۲]ص۳۱۹]

ناسخ ومنسوخ غلط:

فقہائے اسلام نے نہایت غلط قیاس اور بے جا استدلال سے اور صرف اپنے دل کے پیدا کیے ہوئے خیالات سے قرآن کی آیتوں کا اس طرح پر منسوخ ہونا قرار دیا ہے جو خدا کی شان اور قرآن کے ادب کے بالکل برخلاف ہے اور ہرگز مذہب اسلام کا وہ مسئلہ نہیں ہے اور نہ ان فقہا کے استنباط کے لیے کوئی دلیل ہے۔[تفسیر القرآن[۱]ص۱۶۵]

اور کوئی حرف بھی اس سے خارج نہیں ہے اور نہ قرآن مجید کی کوئی آیت منسوخ ہے۔[تفسیر القرآن[۱]ص۱۶۳]

اور اس لیے ہم کہتے ہیں کہ قرآن میں ناسخ ومنسوخ نہیں ہے۔[تفسیر القرآن[۱]۱۶۷]

تاریخ اسلام کی کتابیں مہابھارت کے برابر ہیں:

میرے نزدیک سیرت ہشام اور ابن اسحاق وغیرہ سب واہیات اور الف لیلہ اور مہابھارت کے برابر ہیں۔بلاشبہ میں ان کتابوں کو نہایت غیر معتبر جانتا ہوں۔ہزاروں روایتیں غلط اور بے سند ان میں مندرج ہیں۔[تہذیب الاخلاق[۲]ص۳۳۵]

مردہ پرندوں کا واقعہ خواب تھا:

یہ ایک رویا حضرت ابراہیمؑ کا ہے۔[تفسیر القرآن[۱]ص۲۹۲]

حضرت اسحٰق کی پیدائش معجزہ نہیں:

[تفسیر القرآن[۵]ص۳۸]

حضرت موسیٰ، عیسیٰ، یونس کے معجزات نہیں تھے:

[۱]عصا کا سانپ دکھائی دینا:[تفسیر القرآن[۳]ص۲۲۲]

[۲]جادوگروں سے مقابلہ:[تہذیب الاخلاق[۲]ص۳۵۴]

[۳]ید بیضا:[تفسیر القرآن ص۲۲۵]

[۴]پانی کا پھٹ جانا:[تفسیر القرآن[۱]ص۷۱]معجزے نہیں تھے۔

حضرت یونس کے معجزات کا مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکل آنا معجزہ نہیں تھا۔

[تفسیر القرآن[۸]ص۲۲۵][تحریر فی اصول التفسیر،ص۵۷][تفسیر القرآن[۸]ص۲۲۶]

حضرت عیسیٰ کے معجزات:[۱]بن باپ کے پیدائش معجزہ نہیں۔[تفسیر القرآن[۲]ص۲۲]

آں حضرت صلعم کے معجزات:

معراج النبی کا واقعہ: [تفسیر القرآن [۶] ص ۵۷]

شق قمر معجزہ نہیں: [تصانیف احمدیہ، حصہ ا، جلد ا، ص ۲۱]

فرعون کا خوف اور لڑکوں کا قتل:

[تفسیر القرآن [۳] ص ۲۲۹]

گوسالہ سامری کا بولنا: [تفسیر القرآن [۳] ص ۲۴۸-۲۴۹]

من وسلویٰ کی نعمت معجزہ نہیں: [تفسیر القرآن [۱] ص ۱۰۹]

نزول مائدہ معجزہ نہیں: [تفسیر القرآن [۲] ص ۲۴۹-۲۵۰]

خضر کی حقیقت:

......اس کی نسبت علمائے متقدمین نے بہت اختلاف کیا ہے۔ اکثر تو کہتے ہیں کہ یہ خضر پیغمبر تھے جو اب تک جیتے ہیں اور جیتے رہیں گے اور قیامت کے بوریئے سمیٹیں گے مگر لوگوں کو دکھائی نہیں دیتے۔ کبھی کسی بھولے بسرے کو راہ بتا دیتے ہیں اور کبھی کسی کو علم لدنی سکھا دیتے ہیں۔

[تفسیر القرآن [۷] ص ۲۴]

اصحاب کہف کی محیر العقول تفصیلات:

یہ ایک معمولی بات ہے کہ نیک اور بزرگ لوگوں پر جو ظلم اور سختی ظالموں کے ہاتھ سے گزر جاتی ہے بعد کو ان کی نسبت بہت سی زائد اور عجیب باتیں بڑھا دی جاتی ہیں، اسی طرح اصحاب کہف پر جو حالات اور واقعات گزرے ان کو بطور تعجب انگیز کہانی کے بنالیا ہے اور بے سروپا اور محض بے ہودہ روایتیں مشہور ہوگئی ہیں۔

اس ظالم بادشاہ نے ان لوگوں کو، جو تعداد میں اس وقت چھ تھے، بلایا اور مذہب عیسوی چھوڑنے اور بت پرستی کرنے کو کہا مگر ان سب نے انکار کیا۔ اس پر بادشاہ نے ان کو مہلت دی اور اس مہلت میں وہ شہر سے بھاگے اور ایک چرواہا مع کتے کے ان کے ساتھ ہولیا اور وہ سب ایک پہاڑ کی کھوہ میں، جو شہر افسوس سے کچھ فاصلہ پر تھی، جا کر چھپ رہے۔

اکثر مورخین اور اہل تفاسیر نے لکھا ہے کہ وہ لوگ پہاڑ کی کھوہ میں جا کر سو رہے اور زمانہ دراز، تین سو یا تین سو نو برس، سونے کے بعد جب اٹھے تو انھوں نے ایک شخص کو کھانا خریدنے کو شہر میں بھیجا...... جو محض غلط ہے اور صرف بنایا ہوا قصہ ہے۔ مگر اصلیت اس کی، جیسے کہ محققانہ نظر سے پائی جاتی ہے، صرف اس قدر ہے کہ وہ لوگ رات کے وقت شہر سے بھاگے تھے...... صبح ہوتے وقت وہ لوگ پہاڑ کی کھوہ پر پہنچے...... وہ کھوہ میں گئے۔ رات کے جاگے رستہ چلے تھکے ہوئے تھے۔ کھوہ میں، جہاں بالکل اندھیرا تھا، سو رہے۔ کچھ شبہ نہیں ہوسکتا کہ دو تین پہر سونے کے بعد وہ اٹھے اور آپس میں پوچھنے لگے کہ ہم کتنی دیر سوئے۔ کسی نے کہا دن بھر، کسی نے کہا کچھ کم، کیونکہ کھوہ کے اندھیرے میں وہ دن کا انداز ٹھیک ٹھیک نہیں کر سکتے تھے۔ جب وہ اٹھے تو انھوں نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک شخص کو کھانا لانے کو بھیجا۔

معلوم ہوتا ہے کہ دو تین روز تک......اسی طرح خرید کر لاتا رہا۔ جب وہ بادشاہ، جو ان کو مہلت دے کر شہر سے باہر چلا گیا تھا، پھر شہر میں آیا......تو اس کو معلوم ہوا کہ وہ لوگ شہر سے بھاگ گئے ہیں اس نے ان کی تلاش شروع کی اور پہاڑ کی کھوہ میں ان کا پتہ لگا، اور اس نے پہاڑ کی کھوہ کا منہ بند کروا دیا تا کہ وہ اسی میں بھوکے پیاسے مر رہیں۔ اگرچہ بعض مورخوں اور مفسروں نے

لکھا ہے کہ کھوہ میں پڑے سوتے ہیں یعنی مرے نہیں ہیں۔

ایک زمانہ دراز کے بعد، خواہ وہ زمانہ دوسو برس کا ہو یا ڈھائی سو برس کا یا تین سو برس کا یا تین سو نو برس کا، کسی شخص نے اس کھوہ کے منہ کو کھولا جیسا کہ اکثر روایتوں میں بیان ہوا ہے، ان لوگوں کے پاس، جو کھوہ میں گئے تھے، اس زمانے کے سکہ کے روپے موجود تھے اور جس شخص نے اس کا منہ کھولا تھا اس نے وہ روپے پائے ہوں گے اور جب بازار میں لے گیا لوگوں نے چرچا کیا ہوگا کہ اس نے خزانہ پایا ہے۔ حاکم تک اس کو پکڑ کر لے گئے ہوں گے اور اس نے تمام قصہ پہاڑ کی کھوہ میں لاشوں کے ہونے کا اور وہاں سے روپیہ ملنے کا بیان کیا ہوگا۔ اس پر وہاں کے حاکم اور شہر کے لوگ ان کے دیکھنے کو آئے اور جانا کہ یہ ان لوگوں کی لاشیں ہیں جو دقیوس قیصر کے ظلم سے بھاگے تھے۔ راویوں اور لوگوں نے اس اصلی واقعہ کو اس طرح پر بنالیا کہ اصحاب کہف کئی سو برس بعد سونے کے اٹھے یا مردہ سے زندہ ہوگئے اور ان ہی میں کا ایک شخص روپیہ لے کر بازار میں آیا اور چرچا ہوا اور سب لوگ پہاڑ کی کھوہ پر گئے۔ پھر کسی نے کہا ''وہ زندہ تھے'' ایک آدھ بات کہہ کر مر گئے'' کسی نے کہا کہ مسلّم بغیر کسی نقصان کے لاشیں تھیں مگر ان میں ارواح نہ تھی۔ ایسے واقعات میں اس قسم کی افواہیں اڑا کرتی ہیں اور رفتہ رفتہ روایتیں بن جاتی ہیں اور کتابوں میں لکھی جاتی ہیں، اور مذہبی لگاؤ سے لوگ اس کو مقدس سمجھتے ہیں اور معجزہ اور کرامات قرار دیتے ہیں۔

[ترقیم،ص۱۲،۱۳،۱۴،۱۵،۲۰][خطباتِ احمدیہ ص۳۳۹]

شہاب ثاقب اور شیاطین:

جو شیطان یا جن آسمان پر باتیں سننے جانا چاہتا ہے اس پر شہاب ثاقب کی مار پڑتی ہے اور رات کو جو ہم ستارے ٹوٹتے دیکھتے ہیں یہ وہی شعلہ ہائے آتشیں ہیں جو شیطانوں اور جنوں کو مارے جاتے ہیں۔ مگر یہ سب باتیں غلط اور لوگوں کی بنائی ہوئی ہیں، مذہب اسلام اور خدائے پاک کا کلام ان دوراز کار قصوں سے پاک ہے۔ [تہذیب الاخلاق [۲] ص۳۷۳]

ہر موحد مسلمان ہے:

تمام موحد مسلم و ناجی ہیں۔ پھر جو کوئی چاہے اپنے خیالات فاسد سے ہمارے اس قول کے اور کچھ معنی قرار دے لے۔ [مقالات سرسید [۳] ص۲۰]

انسان کی نجات صرف اس پر ہے کہ جو قویٰ خدا تعالیٰ نے اس میں رکھے ہیں اور جس قدر رکھے ہیں ان سب کو بقدر اپنی طاقت کے کام میں لاتا رہے۔ اب اگر ہماری بناوٹ ایسی ہے جس میں قوائے بہیمیہ ہم پر غالب ہیں تو ضرور وہ گناہ ہم سے ہوگا۔ پس اگر ہم نے اس قوت کو جو اس کی برائی ہم کو بتاتی ہے، بے کار نہیں چھوڑا تو ہم پر کچھ گناہ نہیں ہے کیونکہ ہم نے پورا پورا فرض ادا کیا ہے اور اگر ہم نے اس نور قلب کو بے کار چھوڑ دیا ہے تو ہم خود اپنے اختیار سے گناہ گار اور مستوجب عذاب ہوئے ہیں۔ [تہذیب الاخلاق [۲] ص ۲۳۶۔۲۳۷]

دیدار باری تعالیٰ قیامت میں بھی ممکن نہیں:

خدا کا دیکھنا دنیا میں نہ ان آنکھوں سے ہوسکتا ہے اور نہ ان آنکھوں سے جو دل کی آنکھیں کہلاتی ہیں، اور نہ قیامت میں کوئی شخص خدا کو دیکھ سکتا ہے۔ [تفسیر القرآن [۳] ص۲۵۳]

حضرت یوسفؑ کا خواب اور واقعہ اتفاقی ہے ان کی تعبیر بھی محض اتفاقی تھی:

ایک مدت بعد حضرت یوسف علیہ السلام کے ماں، باپ، بھائیوں کا مصر میں جانا اور موافق آداب سلطنت کے آداب بجالانا ایک امر اتفاقی تھا کیوں کہ یہ بات قرآن مجید سے نہیں پائی جاتی۔[تفسیر القرآن[۵]ص۸۱۔۸۲]

دنیاوی معاملات مذہب میں داخل نہیں:

دنیاوی امور کا قرآن مجید میں ذکر ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ دنیاوی معاملات بھی مذہب میں داخل ہیں۔[مقالات سرسید[۵]ص۹]

سرسید اور پردہ میں سختی:

پردہ کے بارے میں سرسید کا اپنی رائے پر عمل کا جو عالم تھا اس کے متعلق نواب محسن الملک بیان کرتے ہیں''میں نے تو ان کا یہ حال دیکھا کہ مدت العمر کبھی وہ اس بات کے بھی روادار نہیں ہوئے کہ ان کی بہو محمود بیگم کسی بڑے سے بڑے جلیل القدر انگریزی کی میم صاحبہ سے بھی مل سکیں، خواہ ان کے دوستوں کی خاتونیں ہوں یا سید محمود کی۔[مجموعہ لیکچرز واسپیچز ،نواب محسن الملک ص۵۱۳]

اسلام کا لباس سے کوئی تعلق نہیں:

اگر مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ لباس کو اسلام میں کچھ دخل ہے تو یہ ایک سخت بدعت ہے۔[سفر نامہ پنجاب،ص ۱۷۶۔۱۷۷]

اردو کی بجائے انگریزی ذریعہ تعلیم کی اہمیت:

انگریزی ابتدائی اسکولوں میں ورنیکلر زبان کے ذریعہ سے یورپین علوم کو پڑھانا تعلیم کو برباد کرنا ہے۔[بحوالہ حیات جاوید[ا]ص۲۴۶]

حضرت ابوبکرؓ کا زمانہ خلافت شمار نہ کیا جائے:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ خلافت تو شمار کرنا نہیں چاہیے کیونکہ درحقیقت وہ زمانہ بھی حضرت عمرؓ ہی کی خلافت کا تھا اور وہی بالکل دخیل ومنتظم تھے۔[تصانیف احمدیہ،حصہ ا،جلد ا،ص ۴۷]

ہندوستانی عیش کرتے ہیں:

میں نے انگلستان میں چند مہینے بسر کیے ہیں اور میں اپنے ذاتی تجربے اور واقفیت سے کہہ سکتا ہوں کہ جس آسائش سے ہندوستان کے باشندے زندگی بسر کرتے ہیں اس طرح خود انگلستان کے باشندے آسائش سے بسر نہیں کرتے۔[دسمبر ۱۸۹۷ء][مکمل مجموعہ لیکچرز،ص ۵۷۳]

ملکۂ معظّمہ کی حکومت قائم رہے:

میری قسمت ہو کہ میں وائسرائے ہوجاؤں تو میں یقین دلاتا ہوں کہ نہایت مضبوط وائسرائے کے طور پر ملکہ معظّمہ کی حکومت ہندوستان میں قائم رکھوں۔[مکمل مجموعہ لیکچرز،ص ۳۴۸]

انگریزی حکومت ہمیشہ ہند میں قائم رہے:

ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ صرف ایک زمانہ دراز تک ہی نہیں بلکہ اٹرنل (eternal) ہونی چاہیے۔ ہماری یہ خواہش انگلش قوم کے لیے نہیں ہے بلکہ اپنے ملک کے لیے ہے۔ ہماری یہ آرزو انگریزوں کی بھلائی یا ان کی

خوشامد کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اپنے ملک کی بھلائی و بہتری کے لیے ہے۔ [ایڈرس اور اسپیچز ،ص ۷۵]

کالوں کی اطاعت کا حکم ہے تو گوروں کی اطاعت سے گریز کیوں؟

ہمارے مذہب، ہمارے خدا کا حکم ہے، رسولؐ کا حکم ہے کہ حاکم کی اطاعت کرو، گو وہ غلام حبشی ہی کیوں نہ ہو۔ [سفرنامہ پنجاب، ص ۱۱۷]

وہ تو کالے نہیں، بہت گورے ہیں، تو ہم ان گورے منہ والوں کی، جن کو خدا نے ہم پر حاکم کیا ہے، کیوں نہ اطاعت اور وفاداری کریں اور خدا کا حکم بجالائیں۔ [مکمل مجموعہ لیکچرز، ص ۳۷۴]

بغاوت کے بجائے ملک چھوڑ دو:

کسی مسلمان کو ایسے منصوبوں میں شریک ہونا حلال نہ ہوگا جن کی بنا اس ارادہ پر ہو کہ گورنمنٹ انگریزی کو تہ و بالا کردیں اور اگر بالفرض گورنمنٹ انگریزی کی جانب سے کچھ دست درازی بھی ہو تو ان کے حق میں یہ بہتر ہوگا کہ وہ اپنے ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں، نہ کے مقابلے میں بغاوت اختیار کریں۔ [مکاتیب سرسید احمد خاں، ص ۶۵]

شبلیؒ نعمانی: جدیدیت کے نرغے میں:

شبلیؒ نعمانیؒ سرسید سے مختلف جدیدیت پسند تھے مغرب سے وہ مرعوب تھے اس کی وجہ معتزلہ سے ان کی مرعوبیت تھی وہ عقلی دلائل پر زیادہ انحصار کرتے تھے۔ مغربی فلسفے سے واقف نہ تھے لیکن اس کی ضرورت و اہمیت سے بہ خوبی واقف تھے۔ وہ اسلام کی عقلی تعبیر و توجیہہ و توضیح کرنا چاہتے تھے تاکہ دین اس عہد کے تقاضوں کے مطابق آسان ہو جائے ان کا اخلاص، دردمندی، تڑپ کسی تصدیق کی محتاج نہیں لیکن صرف علم، عقل، دلائل کے نتیجے میں شخصیت میں ایک روحانی خلاء پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ روحانی خلاء رفتہ رفتہ ایک ایسی خلیج میں تبدیل ہو جاتا ہے جو کبھی پاٹی نہیں جاسکتی یہی روحانی خلاء سید سلیمان ندویؒ اور ماجد دریا آبادیؒ کو مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں لے گیا، شبلیؒ نعمانی اس روحانی خلاء کا ازالہ متکلمانہ اسلوب سے کرنے کی کوشش کرتے تھے ندوۃ العلماء شبلیؒ نے مسلمانوں کی گمشدہ علمیت کے احیاء کے لیے قائم کیا اس احیاء میں روحانیت، تربیت، للّٰہیت کو مرکزی مقام حاصل نہ تھا، علم الکلام اور عقلیت پر سارا زور تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا فیض خاص یہ تھا کہ ان کی جانشینی سید سلیمان ندویؒ کے ہاتھ آئی جو جدیدیت سے متنفر تھے۔ ندوۃ العلماء کی قیادت حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے ہاتھ میں آگئی جو راسخ العقیدہ عالم تھے اس طرح ندوہ شبلیؒ کی جدیدیت سے بچ گیا لیکن ندوی علماء میں اس جدیدیت کے آثار نظر آتے ہیں اور سنت سے ان کا وہ تعلق نظر نہیں آتا جس طرح دینی مدارس کے طلباء کا تعلق ہونا چاہیے انگریزی کی تدریس کے باوجود ندوہ والے مغربی فکر و فلسفے سے ناواقف رہے اس لیے دارالمصنفین اعظم گڑھ اور ندوہ کی مطبوعات میں مغربی فکر و فلسفے پر کوئی نقد نہیں ملتا فکر مغرب و فلسفہ مغرب پر تنقید کے حوالے سے ندوہ کوئی کام نہ کرسکا۔ شبلیؒ کی عقلیت و جدیدیت کا ایک پرتو ان کی زندگی کے خاموش گوشے سے مترشح ہے۔

شبلیؒ عالم دین یا جمال پرست:

شبلی نعمانیؒ ایک عالم دین ہی نہیں بہت بڑے ادیب، شاعر، تاریخ نگار اور اسلامی تہذیب و تمدن کے شارح بھی تھے۔ وہ ندوہ کی تحریک کے ذریعے مسلم نشاۃ ثانیہ کا خواب دیکھتے رہے تھے۔ لیکن ان کے شب روز جدیدیت کا پرتو تھے اس پرتو کے کئی رخ ہیں، ایک رخ وہ ہے جو شیخ محمد اکرام نے شبلیؒ نامہ میں پیش کیا ہے۔ فاضل اور عالم شبلیؒ بمبئی کی ایک خاتون عطیہ فیضی اور اس خاندان کی عورتوں کے مہمان ہیں۔ خواتین کی مجالس میں بے باکانہ شریک ہیں اور اسے اسلامی تہذیب و تمدن کا نمونہ خیال

فرماتے ہیں۔ اپنی سرگرمیوں کا ذکر نجی خطوط میں نہایت بے باکی سے فرماتے ہیں جس میں زخم دل کھول کر رکھ دیتے ہیں اور قلب کے ٹکڑے شعروں میں سمو دیتے ہیں۔

ایک خط میں نواب حبیب الرحمٰن شروانی کو لکھتے ہیں:

عین اس وقت کہ چمن زارِ بمبئ کی گلگشت نے عالمِ طلسم میں پہنچا دیا تھا۔ بہاولپور کے عہدہ داروں کا خط پہنچا کہ ریاست کے حکم سے ندوہ کے معائنہ کو آتے ہیں۔ اور اس وقت تمہارا ہونا ضروری ہے۔ بالکل اُسی حالت میں بمبئ سے نکلا۔ جس طرح مرحوم شدّاد نے بہشتِ عدن کو خیر باد کہا تھا۔

ایک اور خط میں ہے:

اب کے بمبئ میں عجیب رنگین صحبتیں رہیں۔ لیکن عین عالمِ لطف میں ندوہ کی ایک فوری ضرورت سے یہاں آنا پڑا۔ لیکن آنکھوں میں اب تک وہ تماشا پھر رہا ہے۔

شبلیؒ کئی معبودوں کی پرستش کرتے تھے:

جس افراط سے ان کی زندگی کا مذہبی پہلو زیادہ نمایاں ہوا۔ اسی شدّت سے ان کی اندرونی آگ اور بھڑک اُٹھی۔ لیکن اس مرد باتدبیر نے، جو بہ یک وقت مختلف معبودوں کی پرستش میں کامل دسترس رکھتا تھا۔ ان مخالف جذبات کی تسکین کا سامان کرلیا اور وہ بھی اس خوش اسلوبی سے کہ ان میں کوئی کشمکش پیدا نہ ہوئی۔ اُنھوں نے لکھنو سے بہت دور ایک آستانہ ڈھونڈ لیا۔ جہاں ایک حُسن پرست شاعر کے دل کی ساری حسرتیں پوری ہوتیں لیکن جب وہ لکھنؤ پہنچتے، تو پھر جُبہ و عمامہ پہن کر مجلسِ علما میں صدر پر جا بیٹھتے۔ یہ جدیدیت کا کمال ہے کہ بیک وقت کئی معبودوں کی پرستش پر کامل دسترس کے ساتھ جاری رہتی ہے۔

دستۂ گل یا عطیۂ گل:

شبلیؒ کا ''دستۂ گل'' زیادہ تر شاعر کے اپنے جذباتِ محبت کی رنگ و بُو سے مہکتا ہے لیکن ایک دو چیزیں اور بھی ہیں جو ان اشعار میں بار بار آجاتی ہیں۔ چمن زارِ بمبئ کی تعریف تو کثرت سے ہے۔ پہلی غزل کا مقطع ہے ؎

دامنِ عیش زد ستم نہ رودتا شبلی
دامنِ بمبئ از کف ندہم تا با شم

دوسری غزل تمام کی تمام بمبئ کی تعریف میں ہے۔ مطلع ہے۔

نثارِ بمبئ کن ہر متاعِ کہنہ و نورا — طرازِ مسندِ جمشید و فرِ تاجِ خسرورا

ایک اور مضمون جو کثرت سے دستۂ گل میں نظم ہُوا ہے۔ ریاکاری کا ہے۔ شبلیؒ اپنے مشاغلِ بمبئ کا ندوۃ العلماء کے مقاصد متبرکہ سے موازنہ کرتے ہوں گے، تو دل ہی دل میں ضرور ہنستے ہوں گے۔ اور دل کا یہ چور کئی اشعار میں نظر آجاتا ہے۔ ''شیشۂ تقویٰ'' کی شکست کے اشعار دستہ گل میں دل شوریدہ سر کی کہانیاں بار بار سناتے ہیں۔ جدیدیت پسند دل روایت شکنی میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا۔ الہٰ آباد کی ایک غزل میں یہی مضمون بیان ہُوا ہے

من کہ در سینہ ولے دارم و شیدا چہ کنم — میل بالالہ رَخاں گر نہ کُنم تاچہ کُنم
ہست چل سال کہ بیہودہ نگہ داشتمش — گر نہ برسنگ زنم شیشۂ تقویٰ چہ کُنم

ان اشعار میں تو بے بس ہوکر راہِ تقویٰ سے انحراف کا ذکر ہے۔ لیکن بعض شعروں میں شبلیؒ اپنے اس ''تقویٰ سی سالہ'' کی

اصلیت سے بھی پردہ اُٹھادیتے ہیں

غیر ازیں از رندیِ من تا بہ تقویٰ فرق نیست
برملا ہم کردم اکنوں، آنچہ پنہاں کردہ ام!

ایک اور جگہ کہتے ہیں

از زہدِ دروغِ خود بفریفتہ ام خلقے
اے دوست چہ مے پُرسی تا من چہ ہُنر دارم

شبلیؒ کو فتنہ گر کی آرزو تھی:

شبلیؒ نے ایک صفحۂ کاغذ پر یہ شعر اور اس غزل کے دو اور اشعار اپنے دستِ خاص سے لکھ کر عطیہ بیگم صاحبہ کو دیے تھے۔ جہاں اپنے دستخط کیے ہیں وہاں یہ بھی لکھا ہے۔ ''اگر در خانہ کس است یک حرف بس است''۔

شبلیؒ کی غزل گوئی میں غزل کے خارجی پہلو بھی بُری طرح نمودار ہو گئے ہیں۔

جائے آنست کہ گلشن ومداز کنج لبم — بوسہ ہا بسکہ برآں عارضِ خنداں زدہ ام
بوسہ ہا برلبِ نوشیں زدہ ام از پئے ہم — طوطی گرسنہ ام، برشکرستاں زدہ ام

''دستۂ گل'' میں تین طرح کی غزلیں ہیں۔ پانچ ابتدائی غزلیں تو وہ ہیں، جو شبلیؒ نے ستمبر ۱۹۰۶ء میں بمبئی میں یا بمبئی سے واپس جاتے وقت لکھیں پھر کئی غزلیں ہیں۔ جو الٰہ آباد یا لکھنؤ میں لکھی گئیں۔ اور جن میں یا تو بیتے ہوئے لمحوں کی یاد ہے۔ یا کسی مقامی فتنہ گر کی آرزو۔ غزلوں کا زیادہ حصہ وہ ہے۔ جو دسمبر ۱۹۰۷ء میں بمبئی واپس جا کر لکھا گیا۔ پہلی دو تین غزلیں تو ایسی ہیں جو آسمانِ بمبئی کے عام پُر سواد منظر اور اختر و نجوم کی فراوانی کا بیان ہیں۔ لیکن چوتھی غزل دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ اب اس آسمان پر ایک ماہتاب نمودار ہو گیا ہے۔ اور مولانا کے اشعار عام شاعرانہ جذبات کا اظہار نہیں۔ بلکہ ماہِ تمام کی پرستش کے گیت ہیں۔ اس غزل میں مولانا لکھتے ہیں۔

ہاں وہاں دست بدار ید زمن اے احباب — کہ بہ زیبا صنمے دست بہ پیماں زدہ ام
کس چہ داند کہ بہ خلوت گہِ آں ماہِ تمام — زدہ ام ساغرو بریادِ حریفاں زدہ ام

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ معارف پریس میں جو دستۂ گل چھپی ہے۔ اس میں ماہِ تمام کو اسی طرح جلی قلم سے لکھا گیا ہے جس طرح دوسرے اسمائے معرفہ کو اور شبلیؒ نے مولانا ابوالکلام آزاد کے نام کئی خطوط میں ماہ کامل یا ماہ تمام کا اس طرح ذکر کیا ہے گویا اس سے کوئی خاص شخص مُراد ہے۔ یہ خاص شخص عطیہ فیضی ہیں۔

مقطع میں تو صاف اظہار ہے:

لیے تواں بُرد کہ ایں زمزمہ بے چیزے نیست — شبلیؒ ایں تازہ نواہانہ چو مستاں زدہ ام!

شبلیؒ اور ماہ تمام کی صحبتیں:

ستمبر ۱۹۰۶ء میں تو شبلیؒ کو ماہ تمام کی فقط ایک آدھ جھلک نظر آئی تھی۔ لیکن ۱۹۰۷ء کے آخر اور ۱۹۰۸ء کے شروع میں انھیں موقع ملا کہ وہ آرام واطمینان سے اس کی ضیا باریوں سے حظ اُٹھائیں۔ مئی ۱۹۰۷ء میں ان کے پاؤں کا واقعہ پیش آیا۔ اور وہ پاؤں بنوانے کے لیے دسمبر ۱۹۰۷ء میں بمبئی روانہ ہو گئے۔ اب جب تک پاؤں تیار نہ ہو جاتا ان کا بمبئی میں رہنا ناگزیر تھا۔ چناں چہ وہ دسمبر، جنوری اور فروری کے کچھ دن بہارستانِ بمبئی میں رہے۔ جلوت اور خلوت کی صحبتوں میں شریک ہوئے۔ اور وسطِ

فروری میں ندوہ کے ضروری کاموں کے لیے بالکل مجبور ہو کر اور بڑی کراہت و تکلیف کے ساتھ لکھنو واپس گئے۔ اس دوران میں ''بڑی دل چسپیاں رہیں جو موزوں ہو کر قلم سے نکلیں'' اور پچھلے سال کی بعض غزلوں کے ساتھ ایک گلدستے میں بندھ کر دستۂ گل کے نام سے شایع ہوئیں۔

جب شبلیؒ واناول العابدین کے مرتبے کو پہنچے:

خطوطِ شبلیؒ میں عطیہ بیگم صاحبہ اور زہرا بیگم صاحبہ دونوں کے نام خطوط ہیں لیکن زیادہ تر عطیہ صاحبہ سے خطاب ہے۔ اور مولانا کو اس قابل اور باکمال جب شبلیؒ پہلے بجاری بنے، سالہ لڑکی نے جس طرح مسحور و بیخود بنا دیا تھا۔ اس کا اندازہ خطوطِ شبلیؒ کے صفحے صفحے سے ہوتا ہے۔ وہ عطیہ بیگم کی بعض خوبیوں کا ذکر کر کے انھیں لکھتے ہیں۔

ان باتوں کے ساتھ اگر تم موسیقی سے بھی واقف ہو تو اجازت دو کہ لوگ تم کو پوجیں۔ واناول العابدین (اور میں سب سے پہلا پجاری ہوں گا!)

میرا ہر رونگٹا تمہاری تعریف کا شعر ہے:

ایک اور خط کا آغاز ہے:

رگِ سنگم، شرار سے مے نویسم
کفِ خاکم غبارے مے نویسم

قرۃ عینی! تمہارا خط جو مدت کے بعد ملا تو بے ساختہ میں نے آنکھوں سے لگایا اور دیر تک بار بار پڑھتا رہا۔

ایک اور جگہ اپنے ایک شعر کا جس میں کنایتہً عطیہ صاحبہ کا نام آتا تھا۔ لکھتے ہیں:

اسی اصول پر میرا یہ شعر بھی ہے اور یوں صراحتاً تمہارے لیے خیر مقدم وغیرہ سب لکھ چکا ہوں اور عطیہ! لکھنے پڑھنے کی کیا بات ہے۔ میرا ہر رونگٹا اور ہر موئے بدن تمہاری توصیف اور تعریف کا ایک شعر ہے!

کیا اسلامی تاریخ و تہذیب میں شبلیؒ کی لڑکھڑاہٹ کسی عہد کے علماء میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ یہ بے خودی سرکشی و سرمستی اپنی نوعیت کی منفرد شے ہے اور جدیدیت پسندی اور جدت پسندی سے اس کے تانے بانے مل جاتے ہیں۔

خطوطِ شبلیؒ اور مشرقی ادب:

خطوطِ شبلیؒ مشرقی ادب میں ایک بالکل انوکھی چیز ہے۔ بظاہر تو یہ چند صفحات کا ایک مختصر رسالہ ہے۔ لیکن ان چند صفحات میں ہی محبت کا ایک مکمل ڈرامہ آ گیا ہے۔ [اور اس انداز سے کہ اس میں آورد اور تصنع کا شائبہ تک نہیں] ان خطوط میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک ندی ہے جو پہاڑی چشموں سے پھوٹتی ہے۔ پہلے گلزاروں اور مرغزاروں کی سیر کرتی ہے۔ پھیلتی ہے اور تیز تر اور تُند تر ہوتی جاتی ہے۔ پھر یک لخت تغافل اور عتاب کے صحرا میں جا کر آنکھ سے نہاں ہو جاتی ہے۔ خطوطِ شبلیؒ میں محبت کی چُہلیں ہیں۔ حسن و عشق کے راز و نیاز ہیں۔ اور اخیر اخیر میں حسن کا جلالی رنگ جھلکتا ہے۔

شبلیؒ پہلے پردے کے حامی تھے:

۱۸۹۹ء میں رائٹ آنریبل سید امیر علی نے ایک انگریزی رسالہ میں مُسلمان عورتوں کے متعلق ایک مضمون لکھا۔ جس میں انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہندوستان میں آج کل جو پردہ رائج ہے۔ وہ قرآنی نہیں۔ اور ظہورِ اسلام کے بہت بعد

مسلمانوں میں رائج ہوا۔شبلیؒ نے چند برس بعد الندوہ میں اس کا جواب لکھا۔اور کہا کہ عرب میں پردہ کا رواج اسلام سے بعد کا نہیں بلکہ پہلے کا ہے اور شعرائے جاہلیت کے کلام سے طویل حوالے دے کر ثابت کیا کہ ظہور اسلام سے پہلے تو عرب کے بعض قبیلوں میں مرد بھی ''برقع پہن کر'' اور ''چہروں پر نقاب'' ڈال کر گھر سے باہر نکلتے تھے!!

اپنے مضمون میں علامہ شبلیؒ نے نہ صرف ''نئے تعلیم یافتہ گروہ کے سب سے مشہور اور مستند مصنف کے ''مبلغ علم'' کا مذاق اُڑایا بلکہ لگے ہاتھوں امام الہند شاہ ولی اللہؒ کے ''مبہم'' ترجمۂ قرآن پر بھی ہاتھ صاف کر گئے۔جس پر سید امیر علی نے اپنے دعوے کی بُنیاد رکھی تھی۔

عطیہ کے جمال نے شبلیؒ کو بے پردگی پر مائل کردیا:

ان کے مضمون کو کوئی سال دو سال نہ گزرے ہوں گے کہ شبلیؒ کے آسمانِ محبت پر ایک ماہتاب طلوع ہوا جس نے ان کے خیالات میں عجیب طرح کا تموّج پیدا کردیا۔یوں تو عطیہ بیگم کے نام شبلیؒ کے تمام خطوط ان کی طبیعت کے انقلاب کا پتہ دیتے ہیں۔لیکن عورتوں کی تعلیم کے متعلق دونوں کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی اس سے تو خاص طور پر شبلیؒ کی شخصیت کے بعض غیر معروف گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔

شبلیؒ عورتوں کی مطلق آزادی کے قائل تھے:

عورتوں کی تعلیم کے متعلق عطیہ بیگم صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ انھیں عام دنیوی اور معاشی علوم کی تعلیم دے کر مردوں سے آزاد اور بے پروا کرنے کی ضرورت نہیں۔اور ان کی تعلیم مردوں سے مختلف ہونی چاہیے اس پر مولانا انھیں لکھتے ہیں:

> عورتوں کے متعلق تمہاری رائے ہے کہ وہ دنیوی اور معاشی علوم کم پڑھیں۔اور تم اس کو پسند نہیں کرتیں کہ عورتیں خود کمائیں اور کھائیں۔لیکن یادرکھو مردوں نے جتنے ظلم عورتوں پر کیے اس بل پر کیے کہ عورتیں ان کی دست نگر تھیں تم عورتوں کا بہادر اور دیوپیکر ہونا اچھا نہیں سمجھتی ہو۔لیکن یہ تو پُرانا خیال تھا کہ عورتوں کو دھان پان،چھوئی موئی اور روئی کا گالا ہونا چاہیے۔جمال اور حسن، نزاکت پر موقوف نہیں۔تنومندی،دلیری،دیوپیکری اور شجاعت میں بھی حسن و جمال قائم رہ سکتا ہے مردنما عورت زنانہ نزاکت سے زیادہ محبوب ہوسکتی ہے۔

جواب میں عطیہ صاحبہ نے اپنی رائے پر اصرار کیا،اور غالباً دیوپیکر عورتوں کے خلاف کچھ لکھا۔لیکن مولانا کی دماغی گہرائیوں میں جونسوانیت پنہاں تھی اس کا تقاضا کہ وہ محبوب کو بھی مردانہ رنگ میں زیادہ پسند کریں۔وہ جواب میں لکھتے ہیں:

عورتوں کی دیوپیکری پر تم نے اس قدر طولانی تحریر لکھی لیکن میری رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی یہ تو مسلّم ہے کہ صحت کے لیے، تندرستی کے لیے،جسم کی موزونی کے لیے جامہ زیبی کے لیے مردانہ ورزشیں مفید ہیں۔جو کچھ بحث ہے یہ ہے کہ عورتوں کے زنانہ حسن میں فرق آتا ہے میں یہ کہتا ہوں کہ اس سے جمال اور دوبالا ہوجاتا ہے۔یہ صرف میری رائے نہیں بڑے بڑے اہل نظر کا یہی فیصلہ ہے۔کافی ہمدانی کے قصیدے کے چند شعر لکھتا ہوں۔

میرانِ سپاہ اندو عروسانِ وثاق اند	گردانِ جہاں اند ہژ برانِ زماں اند
چوں سیم ہمہ پاک تن و پاک جبیں اند	چوں سنگ ہمہ سخت دل و سخت کماں اند
باقرطۂ رومی ہمہ چوں بدرِ مُنیر اند	بر مرکبِ تازی ہمہ چوں باد فراں اند
مانند تدروند چو با جامِ شراب اند	مانند ہژبراند چو باتیغ دِسناں اند

جمالیاتی نقطۂ نظر کے علاوہ حقوقِ نسواں کے ترجمان شبلیؒ نعمانی عورتوں کو مرد بننے کی اس لیے بھی تلقین کر رہے تھے کہ وہ مردوں سے اپنے حقوق واپس لے سکیں۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

سب سے بڑھ کر یہ کہ جب تک عورتیں نازک ہی بنی رہیں گی مردان کو پورے حقوق نہ دیں گے۔

شبلیؒ نے اپنی رائے کی تائید میں بڑی محکم دلیلیں دیں۔ سوسال پہلے کی یہ دلیلیں دبستانِ شبلیؒ کی وراثت کے دعوے دار جاوید احمد غامدی اور ان کے شاگردوں ڈاکٹر محمد فاروق، خورشید ندیم کی دلیلوں سے مختلف نہیں ہیں بلکہ یہ ورثاء ابھی اس آزاد خیالی تک نہیں پہنچے جہاں شبلیؒ پہنچ چکے تھے۔ عطیہ کے لیے شبلیؒ کی یہ دلیلیں زیادہ کارگر نہ ہوئیں کیونکہ ان کا مقابلہ مردانہ رنگ کی ایک مستقل مزاج عورت سے تھا۔ بالآخر انھیں ہتھیار ڈالنے پڑے اور اس میں بھی انھوں نے ایک جذباتی لذّت محسوس کی عطیہ کو لکھتے ہیں:

<u>مردانہ تعلیم میں، میں ہارا، اور تم جیتیں، لیکن یہ بھی مردانہ پن ہے۔ اور عطیہ! میں تو تم میں تمام خوبیاں مردانہ ہی پاتا ہوں۔</u>

شبلیؒ کی معذرت خواہی عطیہ سے:

لیکن اب شبلیؒ سے باز پُرس کرنے والی ہستیاں نمودار ہو چکی تھیں۔ چنانچہ جب مسٹر مشیر حسین قدوائی نے اسی رنگ کا ایک مضمون الندوہ میں چھپوایا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ عورتوں کی تعلیم محدود ہونی چاہیے تو عطیہ بیگم صاحبہ نے فوراً مولانا شبلیؒ کو ڈانٹ کر کہا:

ایسے مضامین آپ کو شائع نہیں کرنے چاہئیں۔

مولانا نے پھر ہتھیار ڈال دیے اور نہایت معذرت آمیز پیرائے میں جواب دیا:

مشیر حسین صاحب کا مضمون میں نے چھپنے سے پہلے ہرگز نہیں دیکھا کسی نے غلط تم کو لکھ دیا۔ ہاں میں نے کسی قدر اس کو پسند کیا تھا یعنی طرزِ عبارت کے لحاظ سے ورنہ مجھ کو خود اس مضمون پر اعتراض ہے۔ اور اس کو ناقابلِ عمل خیال کرتا ہوں!

شبلیؒ نے عطیہ سے سفرِ یورپ کے دوران میں خط و کتابت جاری رکھی۔ لیکن وہ خطوط محفوظ نہیں رہے جب وہ اکتوبر میں اس سفر سے واپس آئیں۔ تو شبلیؒ نے ایک ایسا خیر مقدم لکھا جو بادشاہوں کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔ بوئے گل کی پہلی غزل ہے ؎

پیکِ فرخندہ قدم مژدہ سرامے آید — کز سفر، یار سفر کردۂ مامے آید
رفت از شہر بداں ساں کہ بہاراں ز چمن — آمد آں گونہ کہ درباغ صبا مے آید
گوئیا یوسفِ گم گشتہ بہ کنعاں آمد — یانگارِ یمنی سُوئے سبا مے آید
رفتنش گرچہ بہ کامِ دلِ احباب نہ بود — چُوں بیا مدبہ مرادِ دلِ ما مے آید
خُوئے خوبش بہ ہماں لطف و صفا ہست کہ بود — ہم بداں قاعدۂ مہرو وفا مے آید
بُوئے جانے کہ مشامِ دل و جاں تازہ کند — بے تواں یافت کزاں بندِ قبا مے آید
ہر کجا مے گذرد عطر فشاں مے گذرد — ہر نسیمے کہ ازاں زلفِ دوتا مے آید
اے دخائے سحر از چرخ فرود آ اکنوں — کاں کہ مے خواستی اور ابد عا مے آید

شبلیؒ غمزدہ آورد دل و دیں بہ نثار
غیر ازیں چیست کہ از دستِ گدامے آید

شبلیؒ کی ناکامیاں اور مایوسی:

اس کے بعد خطوط کا سلسلہ پھر سے جاری ہوا۔ اور شناسائی دوستی اور دوستی بے تکلفی میں تبدیل ہوگئی مولانا شبلیؒ کے سب سے محبت بھرے خطوط عطیہ بیگم کی ولائت سے واپسی کے بعد لکھے گئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مایوسی و کشمکش کے بھی کئی دور آئے۔ اور جو رنگین خواب شبلیؒ کی نگہِ تصور نے دیکھے تھے۔ ان کا پُورا ہونا محال ہوگیا۔ واپس آ کر عطیہ صاحبہ نے جو پہلا خط لکھا اس کے لب ولہجہ کی شبلیؒ شکایت کرتے ہیں۔

عطیہ مزہ: ندوہ بدمزہ

شبلیؒ ٢٤ نومبر ١٩٠٨ء کے ایک خط میں مہدی حسن کو لکھتے ہیں:

''بمبئ کا مہمان (ماہ مان) آج کل حسنِ اتفاق سے یہیں ہے۔ [مراد عطیہ فیضی ہیں] یہ لفظ یعنی اس کا پہلا جزء کبھی اس سے عمدہ تر موقع پر استعمال نہیں ہوا ہوگا۔ لیکن بدقسمتی دیکھیے کہ ندوہ کے بدمزہ کاموں نے دماغ کو اس قدر ابتر کر دیا ہے کہ ایسے موقع سے بھی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ نہ وقت، نہ دماغ، حسرت کا بھی اس سے بڑھ کر منظر دنیا نے نہ دیکھا ہوگا۔ ان صحبتوں میں اس کی قابلیتوں کے حیرت انگیز پہلو نظر سے گزر رہے ہیں۔ اردو، فارسی، انگریزی، فرنچ، زبان دانی، مصوری، نقشہ کشی، پالیٹکس، قوت تحریر۔ ع آنچہ عالم ہمہ می داشت تو تنہا داری۔ افسوس غیرت اور محبت کی کشاکش تھی، ورنہ آپ بھی وہ دیکھتے جو میں کہتا ہوں''۔

شبلیؒ بیمار بیٹی کو چھوڑ کر جنجیرہ چلے گئے:

اس کے بعد خطوط میں زیادہ یگانگت اور بے تکلفی آ گئی۔ اور شبلیؒ نے اپنی بعض آسان اور قابل اعتراض غزلوں کے اشعار عطیہ کو تفصیلی شرح کے ساتھ ارسال کیے۔ اگلے سال انھوں نے چندروز جزیرہ یا بمبئ میں مونٹ روڈ پر رہنے کی خواہش ظاہر کی چناں چہ جزیرہ سے جہاں عطیہ کی بڑی ہمشیرہ نازلی بیگم صاحبہ نواب صاحب سے بیاہی ہوئی تھیں۔ شبلیؒ کو دعوت آئی۔ وہ اپنی بیٹی فاطمہ کو سخت بیماری میں مبتلا چھوڑ کر دہلی بمبئ ہوتے ہوئے جزیرہ گئے اور کئی دن تک اپنے کرم فرماؤں اور دوستوں کے ساتھ مقیم رہے۔ یہ رویہ جدیدیت کے اثرات کا جیتا جاگتا نمونہ ہے جب لذت خون کی محبت پر غالب آجاتی ہے اور ''فنون لطیفہ'' ہی مقصد زندگی بن جاتا ہے۔ اسی زمانے کی ایک اردو غزل ہے۔

کسی کو یاں خدا کی جستجو ہو گی تو کیوں ہوگی
خیال روزہ و فکر وضو ہوگی تو کیوں ہوگی
جو دو دن بھی بسر کرلے گا اس قصرِ معلّٰی میں
اسے خلد بریں کی آرزو ہوگی تو کیوں ہوگی
ہوائے روح پر ور بھی یہاں کی نشہ آور ہے
یہاں فکر مے و جام و سبو ہوگی تو کیوں ہوگی
جنابِ نازلی بیگم کو اور نواب صاحب کو
کسی شے کی جو دل میں آرزو ہوگی تو کیوں ہو گی
کہاں یہ لطف یہ منظر یہ سبزہ یہ بہارستاں
عطیہ! تم کو یاد لکھنو ہوگی تو کیوں ہوگی

جزیرہ کی رنگیں صحبتوں کی یادیں:

جزیرہ سے رخصت ہوئے تو واپس جا کر ایک قطعہ لکھا جس میں جزیرہ کی صحبت ہائے رنگیں کو یاد کر کے کہا ہے۔

یاد صحبت ہائے رنگیں جو جزیرہ میں رہیں — وہ جزیرہ کی زمیں تھی یا کوئی میخانہ تھا
لطف تھا ذوق سخن تھا صحبت احباب تھی — مطرب وردو سرود و ساغر و پیمانہ تھا
سبزہ و گل سے بھرا تھا دامن کہسار سب — غیرتِ خلد بریں ہر گوشۂ ویرانہ تھا
غنچۂ گل کا تبسم تھا ہر اک دم برق ریز — عندلیبوں کی زباں پر نالۂ مستانہ تھا
نشہ آور تھی نگاہ مست ساقی اس قدر — خود بخود لبریز مے ہر ساغر و پیمانہ تھا
اب نہ وہ صحبت نہ وہ جلسے نہ وہ لطف سخن — خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا!

مولانا ایک خط میں بھی جزیرہ کی صحبتوں کو یاد کر کے کہتے ہیں ''جزیرہ کا خواب بیداری میں بھی نظر آتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ 'جزیرہ کا سفر' جس کے لیے انھوں نے اپنی پیاری بیٹی کو بسترِ مرگ پر دراز چھوڑا تھا ان کے لیے بہت مبارک ثابت نہ ہوا۔

شبلیؒ اور عطیہ کی عمریں: کم عمری پر اصرار

عطیہ شبلیؒ سے تیس برس چھوٹی تھیں لیکن شبلیؒ بھی خود کو پختہ عمر نہ سمجھتے تھے اور شعر و شاعری، چہلوں، حیلوں بہانوں سے اس تفاوتِ عمر کو کم کرنے کی کوشش کرتے تھے چناں چہ جب زہرا نے ایک دفعہ شبلیؒ کی صاحبزادیوں کو بہن کہہ کر خطاب کیا تو شبلیؒ نے فوراً انھیں ٹوکا:

> ہاں آپ نے پہلے خط میں صغریٰ اور فاطمہ کو بہن لکھا ہے عزیزانہ تعلق تو قطعی ہے لیکن یہ رشتہ صحیح نہیں۔ حسن صاحب مرحوم (زہرا اور عطیہ کے والد) عمر اور ہر حیثیت سے میرے چچا تھے۔ اسی لحاظ سے رشتہ قائم ہونا چاہیے میری عمر اس وقت صرف پچاس برس کی ہے! اس لیے اتنا بڑا رشتہ میرا حق نہیں۔

زندگی کے دو حصے جدیدیت پسندی میں ممکن ہیں:

اس سے کچھ عرصہ پہلے عطیہ نے خواہش ظاہر کی تھی کہ مدرسہ ندوۃ العلما کا سنگ بنیاد ان کی ہمشیرہ نازلی بیگم سے رکھوایا جائے لیکن ندوہ کے علما تو عطیہ بیگم کو ہی اپنے جلسوں میں نہیں آنے دیتے تھے وہ ان کی ہمشیرہ کے سنگ بنیاد رکھنے پر کس طرح راضی ہوتے۔ چناں چہ شبلیؒ نے عام مخالفت اور مولویوں کی برہمی کا عذر پیش کیا جو فی الحقیقت بجا تھا لیکن ایک بست سالہ لڑکی ان پیچیدگیوں کو کیا سمجھے وہ جب خطوط اور نظموں میں شبلیؒ کا والہانہ اظہار محبت دیکھتی تو ان مصلحت بینیوں پر حیران رہ جاتی۔ چناں چہ عطیہ نے مولانا کا عذر تسلیم نہ کیا۔ اور انھیں بدہمتی کا طعن دیا اس کے جواب میں شبلیؒ نے لکھا:

> تم کہتی ہو کہ میں بہت ''بدہمت'' ہوں میری زندگی کے دو حصے ہیں پرائیوٹ اور پبلک۔ اگر پبلک کام میرے ہاتھ میں نہ ہوتا تو میری ہمت کا اندازہ کر سکتیں۔
>
> تم کو کیا معلوم ہے کہ مجھے کو کیا مشکلات ہیں تم کو کیا معلوم ہے کہ میں اگر عوام کی مرضی کا کسی حد تک لحاظ نہ رکھوں تو ایک نہایت مفید تحریک فوراً برباد ہو جائے۔ [عوام کی مرضی کا خیال ہے لیکن اسلامی تہذیب و روایت اور تاریخ کا خیال نہیں ہے اس عہد کا خدا عوام بن گئے ہیں]۔

عورت کی خواہش: کیا انداز ہے؟

۱۹۰۹ء کے آخر میں جب شبلیؒ کو بمبئی کا چشمۂ محبت سراب بنتا نظر آیا۔ تو انھوں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، مہدی حسن کو اسی خط میں بمبئی سے خالی ہاتھ آنے کی شکایت کی ہے۔ لکھتے ہیں:

الہ اباد بلائیے تو آ جاؤں لیکن شرط یہ ہے کہ بمبئی کانعم البدل نہ سہی برابر سرابر تو ہو کیا امید ہوسکتی ہے؟

اس کے بعد انھوں نے کئی خطوں میں الہ آباد اور مرزا پور کی نسبت اشارے کیے لیکن مہدی حسن ٹال گئے اس پر بعض لطیف اشاروں کے بعد مولانا ایک خط میں صاف صاف لکھتے ہیں:

مجھ کو رنج تھا کہ اب آپ قابلِ خطاب بھی نہیں سمجھتے، بمبئی اور الہ آباد دونوں صدائیں بیکار گئیں!

شبلیؒ اور بیگم مہدی حسن میں فاصلہ:

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا یہ چاہتے تھے کہ بیگم مہدی ان سے پردہ نہ کریں۔ایک خط میں اس کی نسبت لطیف اشارہ ہے۔

آپ تو پردۂ نسواں کے مخالف تھے اور اس پر عمل بھی فرمایا لیکن تلافی یہ کی کہ مردوں کو پردہ میں بٹھا دیا اس صورت سے مجھ کو بھی اختلاف نہیں بات ایک ہی ہے۔

شبلیؒ کیا چاہتے تھے؟

ایک اور خط میں ہے:

واقعی سخت تعجب ہے کہ آپ وعدہ کر کے میزبانی کرنے سے کترا گئے خیر کوئی مصلحت ہوگی۔

مہدی حسن کے نام مولانا کے خطوط میں ایسی مبہم اور معنی خیز عبارتیں کئی ہیں۔لیکن آخری خط سے کچھ معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔اس خط کے بالکل آخر میں کہتے ہیں۔

سرا تو آتا ہے لیکن آپ یا بھاوج صاحبہ ہر دفعہ دامن بچا جاتے ہیں۔ہم جیسے نفوس قدسیہ سے پردہ! اور وہ بھی ساٹھ برس کے بعد!!!

شبلیؒ کا یہ طرز زندگی، طرز گفتگو اسلامی تاریخ، تہذیب و روایت کے سراسر منافی تھا۔یہی طرز عمل ان کے لیے ندوہ سے علیحدگی کا باعث بنا ہے۔ندوہ پر اللہ کا فضل تھا ورنہ شبلیؒ کی شوخیاں اسلامی تاریخ کے اس اہم مدرسے کی رسوائی کا باعث بنیں، جدیدیت پسندی جہاں بھی جاتی ہے خواہش نفس کو الہ بنا دیتی ہے جو بدترین شرک ہے۔

شبلیؒ نعمانیؒ جیسے عظیم الشان شخص کی یہ زندگی اگر عطیہ فیضی، نازلی بیگم، مولانا شیروانی، ابوالکلام آزاد، مہدی حسن اور دستہ گل کے پھولوں کے مابین رہتی اور عام نہ ہوتی تو اچھا ہوتا لیکن دل بے قرار کے ہاتھوں مجبور شبلیؒ اپنے دل کی دھڑکنیں روکنے کے بجائے انھیں گن گن کر اپنے احباب میں تقسیم کر کے اس مشک کو عام کرتے رہے۔افسوس یہ کہ احباب میں سے کسی نے انھیں ٹوکنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ ندوۃ العلماء کی عظیم الشان تحریک برپا کرتے ہوئے یہ طرز زندگی نہ صرف غارت دین ہے بلکہ غارت دنیا بھی ہوگا۔عشق و محبت کا شعلہ اگر صرف دل میں روشن ہو اور نکاح کے ذریعے شرعی قالب اختیار کرے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اس برق زدہ خرمن کی چنگاریوں کو شرق و غرب میں پھیلا دینا اسلامی روایت اور شرافت کے منافی ہے اس لیے ایک روایت میں آتا ہے کہ کوئی شخص محبت میں مبتلا ہوا اور اس محبت کا اظہار کسی سے نہ کیا اور اسی حالت میں اسے موت آ گئی تو وہ شہید ہے۔لیکن شبلیؒ شہید محبت نہیں بننا چاہتے تھے، وہ شہید شہرت ہو گئے اور یہی شہرت اس تاریخی خط کا سبب بنی جو عطیہ فیضی نے شبلیؒ اور اپنے تعلقات کے حوالے سے مکاتب شبلیؒ کی اڑائی گئی گرد کو صاف کرنے کے لیے امین زبیری کے نام لکھا۔یہ مکتوب سادگی پرکاری اور نفاست کا شاہکار ہے۔شبلیؒ کی عظیم الشان زندگی کے اختتام پر جب یہ مکتوب نگاہوں سے گزرتا ہے تو شبلیؒ کی شخصیت نمک کی طرح پانی میں تحلیل ہو جاتی ہے اور آنکھوں سے گرم گرم قطرے رخسار پر گرنے لگتے ہیں۔کیسی اٹھان تھی لیکن انجام کیا ہوا جدیدیت پسندی اسی انجام کا نقطہ آغاز بنتی ہے۔عطیہ کا خط ملاحظہ کیجیے اور جدیدیت پسندی کے کفن کی بخیہ گری بھی۔

عطیہ فیضی کا خط:

مولانا شبلیؒ کی جب ہم سے پہلی ملاقات ہوئی ہے تو ہمارے درمیان کوئی اجنبیت نہ تھی۔ وہ ۱۸۹۲ء میں جب استنبول گئے تھے تو میرے والد مرحوم حسن آفندی صاحب نے جو بارگاہ سلطانی میں کافی رسوخ اور ارکانِ سلطنت پر بہت کچھ اثر رکھتے تھے ان کی بہت خاطر تواضع کی تھی اور علی گڑھ کالج کے پروفیسر کی حیثیت سے خاص حلقوں میں ان کا تعارف بھی کرایا تھا۔

ایک مدت بعد والد مرحوم کا انتقال ہو گیا اور ہمارے خاندان کا مستقل قیام بمبئی میں ہوا۔ ایک مرتبہ ہم بہنوں کو لکھنؤ جانے کا موقع ملا۔ یہاں شیخ مشیر حسین قدوائی بارایٹ لاء وتعلقہ دار گدیہ کے دولت خانہ پر مولانا شبلیؒ سے ملاقات ہوئی۔ جن کی علمی شہرت ہم سن چکے تھے۔ ہم بہنیں ان کی باتوں سے بہت متاثر اور محظوظ ہوئیں۔ اس وقت وہ ایک پرانے خیال کے مولوی معلوم ہوتے تھے۔ اس کے بعد مولانا بمبئی آئے ہم سب نے بزرگ و عالم سمجھ کر بڑی عزت کے ساتھ عزیزوں کی طرح ان کا استقبال کیا اور جب واپس ہوئے تو سلسلہ خط و کتابت جاری ہو گیا۔

دوسرے سال ان کے پاؤں میں گولی لگنے کے بعد وہ مصنوعی پاؤں کے انتظام کے لیے بمبئی آئے اور پھر تو بار ہا آئے ہم سب سے بے تکلفانہ ملاقاتیں رہیں۔ کبھی کبھی ان ملاقاتوں میں ہمارے خاندان کی اور بیگمات بھی شریک ہوتی تھیں۔ علمی، قومی سیاسی باتیں ہوتی تھیں، اور سب ہی عورتیں اور مرد ان کی عزت کرتے تھے۔ جنجیرہ میں بھی ان کو مدعو کیا گیا اور ان کے ندوہ کو بھی اخلاقی و مالی مدد دی گئی۔

ان ملاقاتوں میں اب وہ پہلے کے سے مولانا نہ تھے، نہایت آزاد خیال، عورتوں کی سوسائٹی میں بے تکلف شرکت کرتے تھے۔ رسمی ورواجی پردے کے علمی و عملی طور پر مخالف تھے۔ تعلیم نسواں کے بڑے حامی تھے، شعروشاعری اور مہذب لطائف وظرائف اور خیالات کی یکسانی سے یہ ملاقاتیں بہت دلچسپ ہوتی تھیں۔

غرض ان کی زندگی بھر یہ سلسلہ قائم رہا اور ان کے انتقال کا ہم سب کو عزیزوں کی طرح رنج ہوا ہم نے ان کے خطوط کو جو اس وقت موجود تھے، بڑی حفاظت سے رکھا کیوں کہ ان خطوں میں بھی ایسی ہی باتیں تھیں۔ ان خطوط کی ''ظل السلطان'' میں اشاعت کی اجازت بھی دے دی اور پھر یہ مجموعہ شائع ہوا...... ۔ اسی زمانے میں خطوں کا ایک مجموعہ مکاتیب شبلیؒ کے نام سے شائع ہوا تھا اور اس میں بعض خطوط ایسے بھی شائع کیے جن سے ہمارے نام کے خطوط کے ساتھ رابطہ اور سلسلہ ہے اور میری ذات و شخصیت کے متعلق اشارے ہیں۔ ان خطوں سے ادیبوں اور افسانہ نگاروں کو بھی ایک بڑا مواد اور مشغلہ ہاتھ آ گیا ہے۔ ریڈیو پر تقریر ہوئی اور اردو رسائل میں مضامین شائع کیے گئے۔ اگر چہ ہمارے خطوں میں تو کوئی بات ایسی نہ تھی۔ البتہ مکاتیب شبلیؒ کے خطوں کے ساتھ پڑھنے سے بے شک یہ مواد ملتا ہے۔

مولانا ایک شریف گھر میں ایک عالم، ایک بزرگ اور ایک بہت بڑے مذہبی مشن کے مبلغ کی طرح جاتے ہیں۔ جہاں بڑی عزت سے ان کا استقبال ہوتا ہے لیکن ان کے دل میں اور ہی جذبات پیدا ہو جاتے ہیں جن کو ایسے راز دار دوستوں کے خطوں میں بھی ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ اور ان خطوط کو متدین لوگ شائع کرتے ہیں، ان کو اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچنا چاہیے تھا کہ اگر ان کے خاندان کی خواتین اس پوزیشن میں ہوتیں تو وہ ایسے خطوط کی اشاعت گوارا کرتے۔ انھوں نے یہ بھی غور کیا ہوتا کہ خود مولانا شبلیؒ کے اخلاق کے متعلق دنیا کیا رائے قائم کرے گی۔

ہم نے مولانا کے خطوں کو جو ہمارے نام آتے تھے۔ ہمیشہ معصومانہ روشنی میں دیکھا کیونکہ ان میں بظاہر کوئی ایسی بات نہ تھی کہ ہم میں سے کوئی بھی کسی قسم کی بدگمانی کرتا یا کسی برائی کا احساس ہوتا۔ البتہ بعض میں شوخی ضرور ہوتی تھی جو

شاعرانہ طبیعت کا خاصہ ہے مگر اب محسوس ہوتا ہے کہ یہ رمز و اشارات ان ہی جذبات پر مبنی تھے اور بعض نظموں میں بھی ان کو شاعری کے پردے پر ظاہر کرتے تھے۔

میں محمد امین صاحب زبیری کی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ہماری پوزیشن کو تبصرہ حیات شبلیؒ میں بیان کر کے صاف کر دیا اور دنیا کو اصل حقیقت بتا دی۔ واقعی سعدی کا یہ قطعہ کس قدر صداقت پر مبنی ہے [''کہ انسان کے علم کا اندازہ تو ایک دن میں ہو جاتا ہے لیکن نفس کی خباثت برسوں میں بھی نہیں معلوم ہوتی اور ہم بھی اسی علم و لاعلمی میں رہے''۔] عطیہ فیضی کا یہ خط پڑھنے کے بعد روحانیت کے بغیر عقلیت، علمیت کے کرشمے جدیدیت کا عنوان بن جاتے ہیں۔

خطبات اقبالؒ: ایک مختصر جائزہ

علامہ اقبال کے خطبات کا ناقدانہ جائزہ علامہ سلیمان ندویؒ کی زبانی ڈاکٹر غلام محمد کے املی سے جریدہ ۳۳ میں پیش کیا گیا تھا۔ خطبات اقبال کا خالص فلسفیانہ نقطہ نظر سے جائزہ سہیل عمر نے اپنی کتاب ''خطبات اقبال نئے تناظر'' میں کیا ہے۔ یہ نقد نہایت اہم ہے۔ سہیل عمر نے اس نقد کو ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کے املی قرار دیا ہے لیکن فی الحققیقت یہ نقد ڈاکٹر فاروقی کے منہاج سے بہتر اور زیادہ وقیع ہے۔ خطبات اقبال میں موجود بے شمار شوالے اس کتاب کے ناقدانہ جائزے کا تقاضہ کرتے ہیں۔ لیکن اس تقاضے کی اہمیت جن پر واضح ہے وہ علمیت نہیں رکھتے اور اگر علمیت رکھتے ہیں تو جرأت سے محروم ہیں۔ گزشتہ ستر برس کے ویرانے میں خطبات اقبال کے سلسلے میں منظّم اور موثر تنقید سہیل عمر کی ہے جسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ اگلی قسط میں ہم خطبات کا ناقدانہ جائزہ لیں گے۔ فی الحال خطبات کے ایک حصے پر نقد ملاحظہ کیجیے۔

اقبال و شبلیؒ اسلامی سزاؤں کے اجماع کا رد

[''علامہ اقبال نے کتاب کے چھٹے خطبے ''اسلام میں اصول حرکت'' میں اپنے دور کے پیدا کردہ مسائل کے حوالے پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک نکتہ اٹھایا ہے اور وہ ہے احکام شرعی کے تعین میں الف و عادت اور عرف و رواج کی رعایت رکھنے کا معاملہ۔ اس نکتے کی وضاحت کے لیے علامہ نے شاہ ولی اللہ صاحب کی تصنیف حجۃ اللہ البالغہ سے ایک تحریف شدہ حوالہ دیا ہے اور اس تحریف شدہ حوالے سے اخذ کردہ نتائج پر اپنے استدلال کی بنیاد رکھی ہے۔ شاہ ولی اللہ کی اصل عبارت کی جستجو کی گئی تو یہ بات پہلی مرتبہ سامنے آئی کہ حجۃ اللہ البالغہ کے مذکورہ صفحے پر اس مضمون کی کوئی متعلقہ عبارت موجود نہیں ہے۔''] اقبال نے اسلامی سزاؤں کے بارے میں یہ موقف اختیار کیا کہ وہ قابل تغیر ہیں اور عصر حاضر میں بدلی جاسکتی ہیں۔ یہ نقطہ نظر امت کے اجماعی نقطہ نظر کے برعکس اور قرآن کے نصوص کے خلاف تھا۔ لیکن اپنے دعوے کے لیے دلیل شاہ ولی اللہ کے ایک تحریف شدہ حوالے سے دی گئی تاکہ اپنا مقدمہ مضبوط بنایا جاسکے۔ لیکن شاہ ولی اللہ کا یہ حوالہ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔

امت کے تمام مکاتب فکر کے اجماع کا انکار: انکار کی دلیل شبلیؒ کا تحریف شدہ حوالہ:

ناظم اقبال اکادمی سہیل عمر نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ علامہ اقبال نے اصل کتاب سے حوالہ لینے کے بجائے شبلی کی کتاب ''الکلام'' سے حوالہ لیا۔ شبلی چونکہ جدیدیت پسند اور مغرب سے مرعوب تھے لہٰذا انھوں نے شاہ صاحب کی عبارت میں تحریف کر کے اپنے مطلوبہ مقاصد حاصل کیے۔ [''الکلام میں دی گئی عبارت کو اصل عربی عبارت سے ملا کر دیکھا تو واضح ہوا کہ شبلی نے جو عبارت الکلام میں درج کی اور جسے علامہ نے اپنے استدلال کے لیے شبلی کے بھروسے پر بنیاد بنایا اس میں اور شاہ ولی اللہ کی اصل عبارت میں اختلاف ہے۔''] شبلی نے اپنی زبان شاہ ولی اللہ کے متن میں رکھتے ہوئے دیانت وصداقت کے مسلمہ اصولوں کو نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ پامال کرتے ہوئے پہلے تو [''عبارت کے درمیان سے چھ سطریں حذف کر دیں پھر آخر کی دو سطریں اڑا دیں اور اس کے بعد نہ صرف اس امر کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا کہ عربی عبارت مسلسل نقل نہیں ہوئی بلکہ آخر میں استنباط نتائج کے طور پر اردو میں جو خلاصہ یا مقصود کلام دیا ہے وہ بھی اس طرح درج ہوا ہے کہ بظاہر شاہ صاحب ہی کا مدعا قرار پاتا ہے۔'']

جدیدیت پسندوں کا طریقہ واردات یہی ہے وہ مغرب سے مرغوب ہو کر مغرب کے کسی اصول پر ایمان لے آتے ہیں پھر اسلامی اصول کی تاویل کر کے اسے مغرب کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جدیدیت پسند اپنے علم،

تحقیق، تفحص، تفقہ فی الدین اور وجدان کی آواز پر کوئی قدم نہیں اٹھاتے ان کے سارے اقدام خارجی سہارے کے محتاج ہوتے ہیں اور وہ خارجی سہارا فکر مغرب ہے لہٰذا جدیدیت پسند نتیجہ پہلے اخذ کرتے ہیں، دلیل بعد میں اس نتیجے کے مطابق توڑ مروڑ کر پیدا کرتے ہیں پھر کہیں سے کوئی حوالہ ڈھونڈتے ہیں حوالہ نہ مل سکے تو کسی بھی حوالے میں تحریف کر کے اپنا مدعا ثابت کر دیتے ہیں۔ یہ مرض تمام جدیدیت پسندوں میں عام ہے اور مغرب سے ان کی مرعوبیت کو ظاہر کرتا ہے۔ جدیدیت پسندوں کی تین قسمیں عام ہیں ایک وہ جو مغرب سے قطعاً ناواقف ہیں لیکن اسلامی علوم سے بخوبی واقف ہیں، عبدہٗ، فضل الرحمٰن، رشید رضا شبلی، یوسف القرضاوی، اس فہرست میں شامل ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جو نہ مغرب سے بخوبی واقف ہے نہ اسلام سے اس فہرست میں سرسید احمد، غلام احمد پرویز، غلام جیلانی برق، علامہ مشرقی وغیرہ آتے ہیں۔ تیسری قسم وہ ہے جو مغرب سے بخوبی واقف ہے لیکن اسلامی علوم سے واقف نہیں اس فہرست میں علامہ اقبال وغیرہ شامل ہیں۔

علامہ شبلیؒ نے ایک عظیم گمراہی عام کی:

اقبال نے شبلی کے محرف حوالے سے جو معانی اخذ کیے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض جدیدیت پسند حلقوں میں جو علوم اسلامی پر نہ قدرت رکھتے تھے نہ انھیں ان علوم کے براہ راست مطالعہ کا موقع ملا تھا۔ اقبال کے حوالے سے یہ استدلال کرنے لگے کہ کچھ اجزائے اسلام شریعت نہیں ہیں صرف وقتی حیثیت کی چیزیں ہیں۔ جب ان اجزاء کو متعین کرنے کی نوبت آئی تو ان میں وہ چیزیں بھی شامل کر دی گئیں جو دائرہ اصول ونصوص سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس کی ایک مثال حدود وتعزیرات کو وقتی اور عرب کے جاہلی معاشرے تک محدود قرار دینے والے بیانات میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

سہیل عمر کے مطابق شبلی نے شاہ ولی اللہ کی عبارت میں جو تحریف کی وہ حجۃ اللہ البالغہ، جلد اوّل کے مبحث سادس کے باب ۶۹ ''الحاجة الى دين ينسخ الاديان'' میں واقع ہوئی ہے۔

اقتباس اول

— ٢١٧ —

باب الحاجة الى دين ينسخ الاديان

استقرى الملل الموجودة على وجه الأرض ، هل ترى من تفاوت عما أخبرتك في الأبواب السابقة ؟ كلا ولعمري ، بل الملل كلها لا تخلو من اعتقاد صدق صاحب الملة وتعظيمه ، وأنه كامل منقطع النظير لما رأوا منه من الاستقامة في الطاعات أو ظهور الخوارق واستجابة الدعوات ، ومن الحدود والشرائع والمزاجر مما لا تنتظم الملة بدونها ، ثم بعد ذلك أمور تقتضيها الاستطاعة المعتبرة مما ذكرنا وما يقاربه ، ولكل قوم سنة وشريعة يتبع فيها عادة أوائلهم ، ويختار فيها سيرة حملة الملة وأئمتها ، ثم أحكم بناؤها ، وشدد أركانها حتى صار أهلها ينصرونها ، ويناضلون دونها ، ويبذلون الأموال والمهج لأجلها ، وما ذلك إلا لتدبيرات محكمة ومصالح متقنة لا تبلغها نظر العامة .

ولما انفرد كل قوم بملة ، وانتحلوا سننا وطرائق ، وناضلوا دونها

بأئمتهم ، وقاتلوا عليها بالسيف ، ووقع فيهم الجور ؛ إما لقيام من لا يستحق إقامة الملة بها ، أو لاختلاط الشرائع الابتداعية ودسها فيها ، أو لتهاون حملة الملة ، فأهملوا كثيراً مما ينبغي ؛ فلم تبق إلا دمنة(۱) لم تتكلم من أمر الدين ، ولامت كل ملة أختها ، وأنكرت عليها ، وقاتلتها ، واختفى الحق — مست الحاجة إلى إمام راشد يعامل مع الملل معاملة الخليفة الراشد مع الملوك الجائرة .

ولك عبرة فيما ذكره ناقل كتاب الكليلة والدمنة من الهندية إلى الفارسية من اختلاط الملل ، وأنه أراد أن يتحقق الصواب فلم يقدر إلا على شيء يسير ، وفيما ذكره أهل التاريخ من حال الجاهلية واضطراب أديانهم .

وهذا الإمام الذي يجمع الأمم على ملة واحدة يحتاج إلى أصول أخرى غير الأصول المذكورة فيما سبق .

---

(۱) هي آثار الدار وسوادها .

منها أن يدعو قوماً إلى السنة الراشدة ، ويزكيهم ، ويصلح شأنهم ، ثم يتخذهم بمنزلة جوارحه ، فيجاهد أهل الأرض ، ويفرقهم في الآفاق ، وهو قوله تعالى :

(كُنتُم خَيرَ أُمَّةٍ أُخرِجَت لِلنَّاسِ(۱))

وذلك لأن هذا الإمام نفسه لا يتأتى منه مجاهدة أمم غير محصورة ، وإذا كان كذلك وجب أن تكون مادة شريعته ما هو بمنزلة المذهب الطبيعي لأهل الأقاليم الصالحة عربهم وعجمهم ، ثم ما عند قومه من العلم والارتفاقات ، ويراعي فيه حالهم أكثر من غيرهم ، ثم يحمل الناس جميعاً على اتباع تلك الشريعة لأنه لا سبيل إلى أن يفوض الأمر إلى كل قوم

أو إلى أئمة كل عصر، إذ لا يحصل منه فائدة التشريع أصلا، ولا إلى أن ينظر ما عند كل قوم، ويمارس كلا منهم، فيجعل لكل شريعة، إذ الإحاطة بعاداتهم وما عندهم على اختلاف بلدانهم وتباين أديانهم كالممتنع، وقد عجز جمهور الرواة عن رواية شريعة واحدة، فما ظنك بشرائع مختلفة، والأكثر أنه لا يكون انقياد الآخرين إلا بعد عهد ومدة لا يطول عمر النبي إليها، كما وقع في الشرائع الموجودة الآن، فإن اليهود والنصارى والمسلمين ما آمن من أوائلهم إلا جمع، ثم أصبحوا ظاهرين بعد ذلك، فلا أحسن ولا أيسر من أن يعتبر في الشعائر والحدود والارتفاقات عادة قومه المبعوث فيهم، ولا يضيق كل التضييق على الآخرين الذين يأتون بعد، ويبقى عليهم في الجملة، والأولون يتيسر لهم الأخذ بتلك الشريعة بشهادة قلوبهم وعاداتهم، والآخرون يتيسر لهم ذلك بالرغبة في سير أئمة الملة والخلفاء، فإنها كالأمر الطبيعي لكل قوم في كل عصر قديما أو حديثا۔

شاہ ولی اللہ اصل عبارت: علامہ شبلیؒ کی تحریفات

شبلیؒ نے ''الکلام'' میں اس عبارت کا خلاصہ تحریف کر کے ان الفاظ میں درج کیا ہے۔ ''اوپر بیان ہو چکا ہے کہ پیغمبر جس قوم میں مبعوث ہوتا ہے، اس کی شریعت میں اس قوم کے عادات اور خصوصیات کا خاص طریقہ پر لحاظ ہوتا ہے۔ لیکن جو پیغمبر تمام عالم کے لیے مبعوث ہو اس کے طریقہ تعلیم میں یہ اصول چل نہیں سکتا، کیوں کہ نہ وہ تمام دنیا کی قوموں کے لیے الگ الگ شریعتیں بنا سکتا ہے نہ تمام قوموں کی عادات اور خصوصیات باہم متفق ہو سکتی ہیں۔ اس لیے وہ پہلے اپنی قوم کی تعلیم و تلقین شروع کرتا ہے اور ان کو محاسن اخلاق کا نمونہ بناتا ہے، یہ قوم اس کے اعضا اور جوارح کا کام دیتی ہے اور اسی نمونہ پر وہ اپنی تلقین کا دائرہ وسیع کرتا جاتا ہے، اس کی شریعت میں اگر چہ زیادہ تر وہ قواعد کلیہ اور اصول عام ہوتے ہیں جو قریباً تمام دنیا کی قوموں میں مشترک ہوتے ہیں۔ تاہم خاص اس کی قوم کی عادات اور خصوصیات کا لحاظ زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن جو احکام ان عادات اور حالات کی بنا پر قائم ہوتے ہیں ان کی پابندی مقصود بالذات نہیں ہوتی اور نہ ان پر چنداں زور دیا جاتا ہے۔''

شبلی نے اپنے جدیدیت پسند افکار شاہ ولی اللہ کے نام سے تخلیق کیے۔ جدیدیت پسندوں کا شرعی امور میں یہی رویہ رہتا ہے اگر تحریف ممکن نہ ہو تو اپنے مطلب کی تشریح و تعبیر کر کے ایسے مفہوم اخذ کرو جس کے ذریعے مغرب کے کسی مفکر کی تائید ہوتی ہو۔ مغرب کے کسی اعتراض کی نفی ہو جاتی ہو اور اسلام کو جدت پسند مذہب ثابت کیا جا سکتا ہو۔ شاہ ولی اللہ نے اسلامی سزاؤں کو وقتی قرار نہیں دیا لیکن شبلیؒ نے خود یہ نتیجہ تحریف کر کے اخذ کر لیا۔ اب شبلیؒ کے یہاں شاہ ولی اللہ کی اصل عربی عبارت میں تحریف اور اس تحریف سے اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید کے لیے کمالات ملاحظہ کیجیے۔

تحریف شدہ عبارت

[illegible]

سہیل عمر: علامہ شبلیؒ کی بد دیانتی کی تحقیق

سہیل عمر کے مطابق ''دونوں متون کے تقابل سے پہلا انکشاف یہ ہوتا ہے کہ شبلی نے شاہ صاحب کی عبارت میں سے کئی جگہ فقرے حذف کیے ہیں۔''اقتباس اول'' صفحہ ۲ کی دوسری سطر کا نصف آخر اور تیسری چوتھی سطریں ''اقتباس دوم'' میں نہیں ہیں۔آگے چلیے تو ''اقتباس اول'' ص ۲ کی دسویں سطر کے بعد پوری چھ سطریں ''اقتباس دوم'' میں سے اڑا دی گئی ہیں۔بایں ہمہ ''اقتباس دوم'' کی عبارت مسلسل عبارت کی طرح لکھی گئی ہے اور سیاق وسباق میں عبارت کے اندراج یا ترجمے وتمہید میں کہیں یہ اشارہ نہیں کیا کہ ''اقتباس دوم'' کی عبارت مسلسل نہیں ہے بلکہ اسے ''اقتباس اول'' کی حسب ضرورت ''کنٹر یبونٹ'' کر کے مسلسل عبارت کی شکل دی گئی ہے۔آگے چلنے سے پہلے یہ بھی دیکھ لیجیے کہ جتنا حصہ نقل ہو کر ''اقتباس دوم'' میں بار پا سکا ہے اس میں بھی چھ مقامات پر سہو کتابت موجود ہے۔

شاہ ولی اللہ اسلامی سزاؤں میں تبدیلی کے قائل نہیں

سہیل عمر کی تحقیق کے مطابق علامہ شبلیؒ نے تین جگہ عبارت میں قطع و برید کی ہے۔ان میں سے پہلے دو مقامات پر عبارت کے کچھ الفاظ حذف کرنے سے استدلال اور تسلسل کلام پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔لیکن تیسرے مقام پر حذف شدہ فقرے اتنے اہم ہیں کہ ان کے ہونے یا نہ ہونے سے استدلال کا سارا تناظر بدل جاتا ہے۔شاہ صاحب کے الفاظ میں

''اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ شریعت اسلامی میں چوری، زنا اور قتل وغیرہ کی جو سزائیں نبی علیہ السلام کے زمانے میں مقرر تھیں کیا آج بھی وہی سزائیں باقی رہیں گی اور اسی طرح رہیں گی۔'' دونوں اجزاء کا جواب حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم کے باب حدود سے بقدر کفایت مل جاتا ہے۔

''یہ سزائیں شرائع سماویہ میں متوارث چلی آتی تھیں اور تمام انبیاء اور ان کی امتیں اس پر متفق تھیں تو ضروری ہوا کہ ان کو خوب مضبوطی سے پکڑنا چاہیے اور کبھی ان کو ترک نہ کرنا چاہیے۔'' لہٰذا شاہ صاحب کے پورے فکری تناظر میں یہ سوال تو اٹھایا ہی نہیں جاسکتا کہ آج اتنی صدیاں گذرنے کے بعد اور اقوام وملت کی رنگارنگی اور تنوع کے روبرو اسلام کی شرعی سزاؤں کو باقی رکھا جائے یا تبدیل کر دیا جائے؟ یہ سوال ہمارے اقبال شناسی کے حلقوں کا ہو تو ہو شاہ صاحب کا نہیں ہے۔''

شبلیؒ: اجتہاد پیش کرنے کی نہ دلیل تھی نہ جرأت:

واضح رہے کہ یہاں گفتگو نفس احکام کے بارے میں ہو رہی ہے۔شبلیؒ نے اس نکتے پر شاہؒ صاحب کی ترجمانی کے بجائے ان کے مقام اور کام کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے جذبات اور اجتہادات کی ترجمانی کی ہے اور قارئین کو یہ تاثر دینے کی بھرپور کوشش کی ہے کہ شاہ صاحب کی رائے میں زمانہ نبوت سے بعید زمانوں اور مختلف اقوام کے لیے شرعی سزائیں اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہوسکتی ہیں جو فقہ اسلامی میں مذکور ہیں۔شبلی کو اپنے جذبات اور اجتہادات کے اظہار کا حق حاصل تھا لیکن اس کے لیے دلائل ضروری تھے۔شبلیؒ کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی اور اسلام کی پوری تاریخ سے کسی ایک فقیہہ کا فتویٰ شبلیؒ کے موقف کے حق میں نہیں مل سکتا تھا۔شبلیؒ میں جرأت نہیں تھی کہ وہ اپنے منفرد اجتہاد کا اعلان اپنے زور علم پر کر سکیں لہٰذا اس فساد کے لیے شاہ ولی اللہ جیسی عظیم ہستی کا نام استعمال کیا گیا تاکہ ان کے قد پر اپنے علم کا علم لہرایا جاسکے۔

علامہ اقبالؒ کی غلطی: اصل کے بغیر حوالہ

چونکہ ۱۹۲۵ء کے لگ بھگ علامہ اقبال کا ذہن جدیدیت سے اور خصوصاً مغربی فکر و فلسفے سے شدید متاثر تھا لہٰذا اقبال نے اسی تجدد کے زیر اثر پہلے رائے قائم کر لی کہ شرعی سزائیں قابل تغیر ہیں، اب اتنے بڑے دعوے کی دلیل بھی وزنی ہونا

ضروری تھی۔ اقبال علوم اسلامی پر عبور نہیں رکھتے تھے اور سہیل عمر کے مطابق عربی زبان پر بھی انھیں قدرت حاصل نہ تھی لہٰذا انھوں نے الکلام میں موجود شاہ صاحب کے حوالے کو کافی سمجھا اور اسے اپنے موقف کے حق میں علمی دلیل کے طور پر استعمال کیا۔ اصل کتاب سے رجوع نہ کیا، حالانکہ اقبال وکیل بھی تھے اور عدالتوں میں نظائر ہمیشہ اصل کتاب سے پیش کیے جاتے ہیں۔ پھر یہ کسی عام عدالتی مقدمے کا معاملہ نہیں تھا۔ شریعت اسلامی کے نص صریح کا معاملہ تھا جس پر صدیوں سے اجماع امت ہے لیکن اقبال نے اس حوالے کو نقل کرتے ہوئے اتنی احتیاط بھی نہیں برتی جتنی احتیاط وہ عدالت میں چھوٹے چھوٹے مقدمات جیتنے کے لیے برتتے تھے اور عدالت کے سامنے اصل حوالہ پیش کرتے تھے۔ جدیدیت پسند فکر کا مسئلہ یہی ہے کہ وہ جدت کے شوق میں تمام حدود پھلانگ جاتی ہے۔

اقبال: ایمانیات وعقلیات نظم ونثر میں فرق؟

غالباً اقبال نے غزالی کی المنقذ من الضلال اور احیاء العلوم و دیگر کتب کا مطالعہ بھی نہیں کیا تھا۔ کیونکہ دوسرے خطبے 'اسلامی ثقافت' کی روح نظریہ تشکیک [کارتیسی ثنویت] کے پیش رو کے طور پر انھوں نے نظام اور امام غزالی کا حوالہ دیا اور اس کو بھی اسلام کے اختباری رویے اور یونانی فکر کے خلاف بغاوت کے آثار میں شامل کیا جب کہ امام غزالیؒ کے فکر اور کارتیسی ثنویت میں مماثلت تلاش کرنا عجیب بات ہے۔ اقبال نے غزالی کی تشکیک کو دے کارت کے نظریہ اور ارتابیت سے مشابہہ قرار دیا۔ انھوں نے یہ استدلال اصل کتابوں کے مطابعے کے بجائے ثانوی ماخذ پر اعتبار کرتے ہوئے اختیار کیا جس طرح شاہ ولی اللہ کے ضمن میں انھوں نے اسی غلطی کا ارتکاب کیا۔ یہ مثال بتاتی ہے کہ اقبال نے مغرب کے فکر و فلسفے کا تو گہرائی سے مطالعہ کیا لیکن اسلامی علوم، اسلامی فکر و فلسفے پر ان کی نظر نہایت سرسری تھی لہٰذا وہ ان مباحث پر کلام کرتے ہوئے جادہ مستقیم پر گامزن نہ رہ سکے لیکن ان کی شاعری بعض مقامات پر خطبات سے مماثلت کے باوجود بہت سے مقامات پر قرآن وسنت اجماع اور اسلامی تاریخ کی روح کو پورے جذب واثر کے ساتھ اس طرح بیان کرتی ہے کہ ان کی آواز صور اسرافیل اور نغمہ جبرئیل بن جاتی ہے یہی وہ مقام ہے جس کے سامنے اقبال کی نثر کی تمام خامیاں ماند پڑ جاتی ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کی ایمانیات اور عقلیات میں بہت فرق ہے۔ ان کی نثر اور نظم میں بے شمار مقامات پر تضاد ہے۔ ان کے یہاں وہ فکری یکسوئی نہیں ملتی جو مولانائے روم کی نثر و نظم میں حیرت انگیز طور پر موجود ہے جب کہ مولانا روم نے تمام اشعار ارتجالاً کہے اور ان کے شاگردوں ومعتقدین نے نقل کر لیے۔ مولانا روم نے کبھی اس کلام پر نہ نظر ثانی کی نہ اصلاح۔ اس کے باوجود ان کی نثر و نظم میں کامل یکسانیت ہے۔ جس پر مغرب کے محققین ششدر ہو جاتے ہیں۔ مولانا روم کا تمام کلام اگر ایک پلڑے میں رکھا جائے اور مغرب کے تمام بڑے شعراء کا کلام دوسرے پلڑے میں تو مولانا کے اشعار تمام مغربی شعراء سے زیادہ ہوں گے۔ کمیت و کیفیت اور یکسوئی میں اس کی بنیادی وجہ علوم اسلامی میں ان کا رسوخ تبحر اور کمال ہے۔

کیا اقبالؒ کا نقطۂ نظر بدل گیا تھا؟

سہیل عمر کے مطابق ''علامہ اقبالؒ کا وہ خطبہ جس میں یہ عبارت وارد ہوتی ہے اپنی موجودہ شکل میں ۱۹۲۸ء میں تیار کیا گیا سو آج ہمارے پاس جو متن ہے وہ ۱۹۲۸ء تک کی فکر کا آئینہ دار ہے۔'' بعد میں سہیل عمر نے تصریح کی ہے کہ اقبالؒ نے ۱۹۳۳ء میں خطبے پر نظر ثانی کی لیکن عبارت میں ترمیم نہیں کی [ملاحظہ کیجیے صفحہ ۲۸۶ خطبات اقبال نئے تناظر میں] لیکن اس کے باوجود سہیل عمر کا خیال ہے کہ ۱۹۳۴ء کے ایک خط سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے جو سید سلیمان ندویؒ کے نام ہے کہ ان کا نقطہء نظر تبدیل ہو گیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ ایک غلط در غلط نقطۂ نظر قائم کیوں کیا گیا جب دعویٰ بہت بڑا ہو تو پھر اس کی دلیل بھی نہایت وزنی ہونا

ضروری ہے۔امت کے اجماع اور تواتر کو رد کر کے ایک نقطۂ نظر پیش کرنا بہت بڑی جسارت اور گستاخی ہے اسی کا نام جدیدیت ہے اور پھر ایک دعویٰ پیش کر کے اس کی تحقیق بعد میں کرنا اور پھر اس نقطۂ نظر کو تبدیل کرنے کے بعد اسے بیان کرنے میں ہچکچاہٹ سے کام لینا جدیدیت ہے۔ایمان اور دیانت کا تقاضہ یہی ہے کہ اس گستاخی پر معذرت کی جاتی اور خطبے کے تمام مباحث کو واپس لے کر نظر ثانی کی جاتی۔جب اقبال علوم اسلامی پر عبور نہیں رکھتے تھے تو انھیں اس دعویٰ کا حق نہیں پہنچتا تھا۔اپنی خواہش کے مطابق شریعت کی تعبیر کرنا جدیدیت ہے۔علامہ سلیمان ندوی نے اسی لیے خطبات پر تبصرہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔وہ اقبال کی شاعری و شخصیت کے مثبت اثرات کو زائل نہیں کرنا چاہتے تھے۔وہ اقبال کی شاعری کو امت کا قیمتی اثاثہ سمجھتے تھے۔لہٰذا انھوں نے اس وقت اقبال کے خطبات سے صرف نظر کیا۔انھیں اندازہ تھا کہ ان خطبات کو سمجھنا بہت کم لوگوں کے لیے ممکن ہوگا لہٰذا اس پر خاموشی اختیار کی جائے۔ان کا یہ اندازہ درست تھا۔اقبال کی شاعری سے امت فیض یاب ہو رہی ہے اور اقبال کی نثر ستر برس سے طاق نسیاں کی زینت ہے۔

اقبالؒ نے شبلیؒ کا حوالہ کیوں نہیں دیا؟

حدود کو کبھی کسی فقہ نے عارضی مقید،صرف عہد رسالت تک محدود اور عرب کے معاشرے تک محصور نہیں جانا یہ جرأت تاریخ اسلام میں صرف اقبالؒ نے کی اور اس کے لیے دلیل شبلیؒ سے لی اور شبلیؒ کا حوالہ بھی نہیں دیا ورنہ یہ گرد شبلیؒ پر اڑتی۔اقبالؒ بہر حال بچ جاتے۔لیکن اجتہاد کا سہرا شبلیؒ کے سر باندھا جاتا جو گوارا نہ تھا۔علامہ اقبال کو شبلی کی تحریف کا اندازہ ہو گیا تھا کیونکہ علامہ سلیمان ندوی کے نام ۲۸ر ستمبر ۱۹۲۹ء کے مکتوب سے پتہ چلتا ہے کہ حجۃ اللہ البالغہ کا اصل متن اقبال نے ۲۷ر ستمبر ۱۹۲۹ء کو دیکھ لیا تھا۔اس متن سے متعلق استفسارات اور شبلی کے نتیجے کے بارے میں علامہ ندوی نے یہ تبصرہ کیا تھا کہ ''شبلی نے شاہ صاحب کے الفاظ کے جو وسیع معنی قرار دیئے ہیں وہ صحیح نہیں''،اصل متن اور علامہ ندوی کی صراحت کے باوجود علامہ اقبال نے ۱۹۳۵ء تک اپنے خطبے اور خطرناک غلطی سے رجوع نہیں کیا جس کے دو مطلب ہیں یا تو اقبال اپنے موقف کی تائید میں کوئی اور حوالہ تلاش کر رہے تھے یا اقبال اپنی رائے سے رجوع کرنا نہیں چاہتے تھے۔اصل بات یہ ہے کہ اقبال خطبات کے موقف سے رجوع کر چکے تھے۔اس سلسلے میں سید سلیمان ندویؒ کی شہادت کافی اہم ہے۔سہیل عمر نے اپنی کتاب میں ۴ر مارچ ۱۹۳۳ء کی ایک تقریب کی روداد شائع کی ہے۔علامہ اقبال نے اس دن خطاب کرتے ہوئے فرمایا میں نے اپنی زندگی کے ۳۵ برس اسلام اور موجودہ تہذیب وتمدن کی تطبیق میں بسر کر دیئے ہیں اور اس عرصے میں یہی میری زندگی کا مقصد وحید رہا ہے۔میرے حال کے سفر نے مجھے کسی حد تک اس نتیجہ پر پہنچا دیا ہے کہ ایسے مسئلے کو اس شکل میں پیش نہیں کرنا چاہیے............میری رائے میں اس کو یوں پیش کرنا چاہیے کہ موجودہ تمدن کو کس طرح اسلام کے قریب تر لایا جائے۔یہ بیان بھی سلیمان ندویؒ کے بیان کی توثیق ہے۔

اقبال کا اعتراف:میری مذہبی معلومات کا دائرہ محدود ہے

اقبالؒ اہم اسلامی مباحث کی گہرائی اور نزاکت سے بہت زیادہ واقف نہ تھے۔لیکن دین کے لیے ان کی تڑپ ان استفسارات سے نمایاں ہے جو مختلف علماء سے کیے گئے لیکن اس تڑپ کا مرکزی نکتہ اہل مغرب اور مستشرقین کے اعتراضات ہیں۔اقبال اسلامی علوم میں اپنی کم مائیگی کا اعتراف کرتے ہوئے صوفی تبسم کو لکھتے ہیں ''میری مذہبی معلومات کا دائرہ نہایت محدود ہے البتہ فرصت کے اوقات میں اس بات کی کوشش کیا کرتا ہوں کہ ان معلومات میں اضافہ ہو،زیادہ تر ذاتی اطمینان کے لیے نہ تعلیم وتعلم کی غرض سے............اس کے علاوہ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ میری عمر زیادہ تر مغربی فلسفے کے مطالعے میں گزری ہے اور یہ نقطۂ نظر ایک حد تک طبیعت ثانیہ بن گیا ہے۔دانستہ یا نادانستہ میں اسی نقطۂ نگاہ سے حقائق اسلام کا مطالعہ کرتا ہوں۔[اقبال نامہ جلد اول ص ۴۷]۔

اقبال کے نزدیک مغرب کیا ہے؟

یعنی اقبال کے نزدیک کسوٹی، منہاج مغرب کا فلسفہ وفکر ہے اس کسوٹی پر دہ اسلام کو پرکھتے ہیں اس منہاج سے اسلام کا مطالعہ اسی قسم کے تجدد پر ختم ہوگا۔ خطبات میں بھی اقبال یہی فرماتے ہیں کہ جدید مغربی علم کے معاملے میں ہمارا طرز عمل عزت واحترام کے ساتھ آزاد اور معروضی ہو اور اس علم کی روشنی میں ہم اسلامی تعلیمات کی تائید وتحسین کریں۔ (Reconstruction of Religious thought p.136]

اس موقف کے مطابق مغرب کا علم حق قطعی، آخری، غیر مبدل، غیر متغیر اور درست ہے لہٰذا اسی کی روشنی میں اسلام کی تعلیمات کی تائید کی جائے۔ گویا اسلام مغربی فکر وفلسفے کے خارجی ذریعے کا محتاج ہے اس نقطہ نظر کے نتیجے میں اسلام ''الحق'' الکتاب آخری اور دائمی سچ نہیں رہتا بلکہ مغربی فکر الحق کی جگہ لے لیتی ہے یا کم سے کم الفاظ میں اسلام اور مغرب یکساں حق قرار پاتے ہیں۔ یہی جدیدیت ہے۔

اسلامی سزاؤں پر خطبات کی اصل عبارت

For our present purposes, however, we must distinguish traditions of a purely legal import from those which are of a non-legal character. With regard to the former, there arises a very important question as to how far they embody the pre-Islamic usages of Arabia which were in some cases left intact, and in others modified by the Prophet. It is difficult to make this discovery, for our early writers do not always refer to pre-Islamic usages. Nor is it possible to discover that usages, left intact by express or tacit approval of the Prophet, were intended to be universal in their application. Shah Wali Allah has a very illuminating discussion on the point. I reproduce here the substance of his view. The prophetic method of teaching, according to Shah Wali Allah, is that, generally speaking, the law revealed by a prophet takes especial notice of the habits, ways, and peculiarities of the people to whom he is specifically sent. The prophet who aims at all-embracing principles. I however can neither reveal different principles for different peoples, nor leaves them to work out their own rules of conduct. His method is to train one particular people, and to use them as a nucleus for the building of a universal Shari'iih. In doing so he accentuates the principles underlying the social life of all mankind, and applies them to concrete cases in the light of the specific habits of the people immediately before him. The. Shari'ah. values (Ahkam) resulting from this application (e.g. rules relating to penalties for crimes) are in a sense specific to that people and since their observance is not an end in itself they cannot be strictly enforced in the case of future generations.

سیّد نذیر نیازی صاحب نے عبارت کا ترجمہ یوں کیا ہے۔ص۱۳۶:

شاہ ولی اللہ نے اس مسئلے میں بڑی سبق آموز بحث اٹھائی ہے۔ ہم اس کا مفاد ذیل میں پیش کریں گے۔شاہ ولی اللہ کہتے ہیں انبیاء کا عام طریق تعلیم تو یہی ہے کہ وہ جس قوم میں مبعوث ہوتے ہیں ان پر اسی قوم کے رسم ورواج اور عادات وخصائص کے مطابق شریعت نازل کی جاتی ہے۔لیکن جس نبی کے سامنے ہمہ گیر اصول ہیں، اس پر نہ تو مختلف قوموں کے لیے مختلف اصول نازل کیے جائیں گے، نہ یہ ممکن ہے کہ وہ ہر قوم کو اپنی اپنی ضروریات کے لیے الگ الگ اصول عمل متعین کرنے کی اجازت دے۔ وہ کسی ایک قوم کی تربیت کرتا اور پھر ایک عالمگیر شریعت کی تشکیل میں اس سے تمہید کا کام لیتا (۱۵۸)۔لیکن ایسا کرنے میں وہ اگرچہ انھیں اصولوں کو حرکت دیتا ہے جو ساری نوع انسانی کی حیات اجتماعیہ میں کارفرما ہیں، پھر بھی ہر معاملے اور ہر موقع پر عملاً ان کا اطلاق اپنی قوم کی مخصوص عادات کے مطابق ہی کرتا ہے۔لہٰذا اس طرح جو احکام وضع ہوتے ہیں (مثلاً تعزیرات) ایک لحاظ سے اسی قوم کے لیے مخصوص ہوں گے۔ پھر چونکہ احکام مقصود بالذات نہیں، اس لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کو آئندہ نسلوں کے لیے بھی واجب ٹھہرایا جائے۔[یہاں نذیر نیازی نے درست ترجمہ نہیں کیا ہے سہیل عمر کے مطابق انگریزی میں وجوب عدم وجوب کا تو ذکر ہی نہیں وہاں نفاذ میں شدت یا سختی تذکرہ ہے۔]اسی عبارت کا ترجمہ پروفیسر خورشید احمد نے کیا ہے جو زیادہ رواں اور واضح ہے۔

شاہ ولی اللہ نے اس نکتہ پر نہایت بصیرت افروز بحث کی ہے۔ میں یہاں ان کے خیالات کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔شاہ ولی اللہ کے نزدیک پیغمبرانہ اسلوب تعلیم عمومی لحاظ سے یہ ہے کہ کسی رسول پر نازل شدہ شریعت میں ان لوگوں کے عادات واطوار اور خصوصیات کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جاتا ہے جن کی طرف وہ خصوصاً مامور کیے گئے ہوں۔لیکن وہ پیغمبر جس کا مطمع نظر ہمہ گیر اصول ہوں نہ تو مختلف اقوام کے لیے مختلف احکام دے سکتا ہے اور نہ انھیں اپنی روش کے اصول خود وضع کرنے کی کھلی چھٹی دے سکتا ہے۔اس کا اسلوب یہ ہے کہ ایک خاص قوم کو تربیت دے کر اسے عالمگیر شریعت کی بناء تشکیل میں مرکز کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے۔ایسا کرتے ہوئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو ساری نسل انسانی کی معاشرتی زندگی میں کارفرما ہیں، اور ان اصولوں کے پیش نظر قوم کے واقعات پر اس قوم کی مخصوص عادات کی روشنی میں منطبق کرتا ہے۔اس اطلاق سے پیدا شدہ شرعی احکام ایک لحاظ سے خاص اسی قوم سے متعلق ہوتے ہیں (مثلاً سزائے جرم سے متعلقہ قانون) اور چونکہ ان کی تعمیل و پابندی بجائے خود ایک مقصد نہیں ہے اس لیے آنے والی نسلوں پر سختی کے ساتھ اس کا نفاذ نہیں ہوسکتا۔

[چراغ راہ، جلد۱۲، نمبر۷، کراچی، ۱۹۵۸ء، ص۸۲ بحوالہ خطبات اقبال نئے تناظر میں، ص۲۹۶، ۲۹۷]

اس تمام بحث کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ جدیدیت اپنے آپ کو منوانے کے لیے کن کن طریقوں، راستوں سے گزرتی ہے اور مطلوبہ نتائج جو پہلے سے طے شدہ ہوتے ہیں ان کے دلائل کس طرح ڈھونڈتی ہے یہ جدیدیت ماڈرن ازم کا خاص

طریقہ کار ہے۔

شدید مصائب سے عبید اللہ سندھیؒ دماغی توازن کھو بیٹھے:
مولانا حسین احمد مدنی کے طویل مضمون سے اقتباس

مولانا مرحوم افغانستان سے جدا ہو کر روسی ممالک میں پھرتے ہوئے بخارا، ماسکو، اٹلی، استنبول وغیرہ پہنچے اور سالہا سال ان سخت سے سخت اور اجنبی ملکوں میں سرگرداں و پریشان رہے۔ پے در پے مہینوں فاقے کرنے پڑے۔ میل ہا میل پیدل چلنا پڑا۔ برف سے ڈھکے ہوئے ملکوں میں جاڑے کی سخت تکالیف جھیلنی پڑیں۔ تنہائی اور کسمپرسی کا عذاب برداشت کرنا پڑا۔ غیر مسلم ناواقف زبان نہ جاننے والے، اجانب میں بسر کرنا پڑا۔ ان عظیم الشان صدمات اور جانگداز احوال میں مولانا مرحوم کا زندہ واپس آجانا قدرت کے عجوبات میں سے نہیں تو کیا ہے۔

وطن اور مذہب کی آزادی کے لیے اور بھی متعدد اشخاص نے مشکلات اور مصائب جھیلے ہیں، مگر مولانا عبید اللہ مرحوم کی سی مشکلات کس نے جھیلیں۔ اگر غور کیا جائے تو پہاڑ اور ذرے کا فرق پایا جائے گا۔ ان مصائب عظیمہ متناہیہ نے اگرچہ مولانا مرحوم کو موت کے گھاٹ تک پہنچانے میں شکست کھائی اور مولانا کی جان سخت ہی غالب رہی۔ تاہم وہ مولانا کے دماغ اور قلب کے متاثر کرنے میں کامیاب ہوگئیں، مولانا دماغی توازن کھو بیٹھے۔ صبر و تحمل، حلم و بردباری، استقلال اور گراں باری وغیرہ نے جواب دے دیا، فکر، غور اور جرأت طبع جو کہ مولانائے مرحوم کو مضامین عالیہ اور سیاسیات مدنیہ کی عمیق سے عمیق گہرائیوں میں پہنچانے والے تھے، وہ تقریباً کافور ہوگئے۔ مولانا مصائب جھیلتے ہوئے مدینہ و حجاز میں پہنچے اور ہم کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے تو ان کی حالت دیکھ کر ہمارے تعجب اور تحیر کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہم نے دیکھا کہ مولانا کی روشن خیالی وہ حلم اور بردباری، وہ سکون و سکوت جس کو ہم پہلے سنا کرتے تھے، سب کے سب تقریباً رخصت ہو چکے ہیں۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں، چیخنے چلانے لگتے ہیں، غصہ آجاتا ہے۔ باتیں زیادہ کرنے لگتے ہیں، بسا اوقات ایک ہی مجلس میں متضاد اور متخالف امور فرماتے رہتے ہیں۔ ہندوستان تشریف لانے کے بعد بھی ان احوال متضادہ میں کمی نہیں ہوئی، بلکہ کچھ اضافہ ہی رہا۔ جس کی بناء پر ہم کو یقین ہوگیا کہ مولانا کے دماغی توازن پر کاری اثر پڑا۔ اور وہ کیوں نہ ہو، جو ناسازگار ماحول اور گوں ناگوں صدمات عظیمہ ان کو پیش آئے تھے، ان کا یہ اثر بہت ہی کمتریں اثر تھا۔ چنانچہ متعدد مجالس میں خود مولانا بھی اس کے مقر رہے (اقرار کیا) ایسے احوال میں ہر چیز کا جادۂ اعتدال و استقامت سے ہٹ جانا اور جملہ کوششوں میں اختلال پیدا ہو جانا طبعی بات ہے۔ [صدق، ۱۲/اپریل ۱۹۴۵ء]

مولانا سندھی کے افکار سے اقتباسات اور ان پر مولانا ماجد دریا آبادی کے تبصرے ملاحظہ کیجیے۔

اصل اسوۂ حسنہ مصطفیٰ کمال اتاترک کا:

''میں اپنا امام، امام ولی اللہ دہلوی کو بنا چکا ہوں، یورپین انقلابی اس امام کے نظریات سے آگے نہیں بڑھ سکے''۔

(خطاب صدارت مولانا سندھی، صدر جمعیۃ علماء صوبۂ بنگال)

مبتدا یہ تھا، خبر آگے چل کر نکلتی ہے:

برطانوی حکومت سے استفادہ کریں: کمال اتاترک نمونہ ہے

''میں سفارش کرتا ہوں کہ ہمارے اکابرِ مذہب وملت، برٹش گورنمنٹ کے دوصد سالہ عہد سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کی کوشش کریں۔ جس طرح ہم نے یورپ سے تنفر برت کر، اپنی ترقی کو محدود کر لیا ہے، اسے اب خیرباد کہیں، اس معاملہ

میں میں نے ترکی قوم کے اس انقلاب کا پورا مطالعہ کیا ہے، جو سلطان محمود سے شروع ہو کر مصطفیٰ کمال کی جمہوریت پر ختم ہوتا ہے۔ میں اس بارے میں ترکوں کی اس صفت کو قابلِ تقلید سمجھتا ہوں...... میں چاہتا ہوں کہ یورپ کے انٹرنیشنل اجتماعات میں ہمارا وطن ایک معزز مانا جائے، اس لیے ہمیں اپنی معاشرت میں انقلاب کی ضرورت محسوس ہوگی۔

انقلابی نیکر ہیٹ پہنئے:

جو انقلاب میں پیدا کرنا چاہتا ہوں اس کی چند مثالیں سناتا ہوں:

الف) سندھی زبان جسے ہر ایک سندھی اپنی مادری زبان کی حیثیت سے بولتا ہے، رومن حروف میں لکھے گا۔

ب) سندھی اپنے وطن کا بنا ہوا کپڑا پہنے گا، مگر وہ کوٹ و پتلون کی شکل میں ہوگا، یا کالر دار قمیض اور نیکر کی صورت میں...... ہیٹ دونوں صورتوں میں بے تکلف استعمال کیا جائے گا''۔(ایضاً)[واضح رہے کہ مولانا نے کبھی خود نیکر ہیٹ نہیں پہنا]

مبتدا اور خبر کے درمیان جو ربطِ لطیف ہے، اسے چھوڑیے۔ اس نکتہ آفرینی سے بھی قطع نظر کیجیے کہ امام ولی اللہ دہلویؒ کے اقتداء کے متن کی شرح یہ ہے کہ یورپ سے تنفر ختم کیا جائے، رسم الخط نصرانیوں کا اختیار کیا جائے، اور وضع ولباس فرنگیوں کا قبول کیا جائے، داد صرف اس کی دیجیے کہ اب اسوۂ حسنہ مصطفیٰ کمال کا ہے اور انقلاب ہند میں اور سندھ میں برپا کیجیے، جو ''اتاترک'' کے سایۂ رحمت میں ترکی میں برپا ہو چکا ہے! (صدق، ۱۵/جولائی ۱۹۳۹ء)

''مولانا عبید اللہ سندھی محمد سرور کی کتاب سے اقتباسات''

مولانا کی حمایت میں ایک مراسلہ نمبر ۳۸ کے ایڈیٹوریل میں درج ہو چکا ہے اور دوسرا یہ درج ہو رہا ہے، وہ ایک قدیم تعلیم کے عالم کا تھا، اور یہ ایک جدید علوم کے گریجویٹ کا ہے۔ دونوں کے مخلصوں کی سفارشیں اور صفائیاں سر آنکھوں پر، جیسا کہ اس مرتبہ بھی عرض کیا جا چکا ہے، اصل سوال مولانا کی مجلسوں اور مکالموں کا اور ان کے ملنے والوں کے تاثرات کا نہیں، بلکہ مولانا کے مطبوعہ بیانات اور شائع شدہ تحریروں کا ہے۔[صدق ۲۵/فروری ۱۹۴۱ء]

اس سلسلہ میں اخبار و رسائل کی طرف نگاہ اٹھی کہ شاید دل کی الجھن کا مداوا ان کے تبصروں میں مل جائے مگر اس کتاب پر ہنوز کوئی تبصرہ میرے مطالعہ میں نہیں آیا۔ مجبوراً جناب کی طرف مراجعت کر رہا ہوں کہ حسبِ ذیل افکار کے متعلق جناب کا تبصرہ کیا جائے؟

قرآن مجید سے متعلق: قرآن کا پیغام عربوں کے لیے ہے

۱) قرآن کا عالمگیر پیام عرب کے مزاج کے مطابق متعین ہوا ہے۔ قرآن مجید کا بین الاقوامی پیغام رسول اللہ کی قومی زبان اور ان کی قوم کے مزاج کے مطابق معین ہوا ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ عربوں نے اس پیغام کو اپنا لیا اور اس کو پھیلانے اور دنیا میں اسے نافذ کرنے کے کام کو اپنے لیے قومی عزت سمجھا۔ (صفحہ ۲۶۰)

۲) قرآنی احکام مثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کو ابدی عالمگیر ماننا صحیح نہیں ہے۔ یہ صرف عرب کے لیے ایک عملی صورت تھی۔

۳) بیشک قرآن جس قوم میں کہ وہ نازل ہوا، اس قوم کی عادات، شعائر، تعزیرات اور انتظامات کا لحاظ رکھا ہے۔ لیکن اس سے قرآن کی عمومیت اور ہمہ گیریت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ کیونکہ بقول مولانا شبلی جو احکام ان عادات اور حالات کی بناء پر قائم ہوتے ہیں، ان کی پابندی مقصود بالذات نہیں ہوتی اور نہ اس پر چنداں زور دیا جاتا ہے۔

مولانا کے نزدیک بھی قرآن میں کہیں کہیں جو احکام ہیں وہ دراصل ایک مثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان احکام کو اپنی خاص شکل میں ابدی اور عالمگیر ماننا صحیح نہیں۔ عرب کے خاص حالات میں قرآن کے عمومی پیغام کو صرف ان احکام کے ذریعہ ہی عملی صورت دی جاسکتی تھی۔ (صفحہ ۲۵۴)

حلال وحرام: قومی عادات سے متعلق ہیں

(۴ کھانے کی چیزوں کی حلت وحرمت کی بنیاد قومی پسندیدگی اور قومی مزاج پر ہوتی ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ اطعمہ کی تحلیل اور تحریم بیشتر قومی پسندیدگی یا مزاج کے مطابق ہوتی ہے۔ اس کو عالمگیر مذہب کی تعلیم کا اساس بنانا ٹھیک نہیں ہوتا۔ کھانوں کے علاوہ دوسری باتوں میں بھی اگر قوم کے مزاج کا لحاظ رکھا جائے، لیکن اس شرط پر کہ اس سے انسانیت کے عمومی مفاد میں کوئی رخنہ نہ پیدا ہو، تو اس میں کچھ حرج نہیں۔ (صفحہ ۲۵۷)

حدیث وآثار کے متعلق:

(۱ دین کا قانون اساسی صرف قرآن ہے۔ حدیث وحی غیر متلو نہیں ہے، بلکہ مستنبط ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ دین صرف قرآن میں منحصر ہے اور قرآن دین کا قانون اساسی ہے اور آیت ''وما ینطق عن الھوی'' سے مراد صرف قرآن مجید ہے۔ حدیث دراصل قرآن سے مستنبط اور فقہ حدیث سے استنباط کی گئی ہے۔ (ص ۲۴۳)

(۲ سنت نبوی عالمگیر قانون کا حجازی جامہ ہے، جس کی تعبیر زمانہ، ماحول اور اہلِ حجاز کی طبیعت کے مطابق کی گئی ہے جو نہ عمومی ہے نہ ابدی ہے۔

اس عالمگیر قانون کو حجاز میں عملی جامہ پہنایا گیا۔ یہ جامہ اس عالمگیر قانون کی ایک تعبیر ہے، جو زمانہ، ماحول اور اہلِ حجاز کی طبیعت کے مطابق کی گئی، اس تعبیر کو اصل قانون کی طرح عمومی اور ابدی سمجھنا ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن اس تعبیر کو عالمگیر قانون کے خلاف یا اس پر زائد جاننا بھی غلط ہے، سنت اسی عالمگیر قانون کے حجازی جامہ کی ایک تصویر ہے۔ (ص ۲۴۲)

(۳ سنت وہ تمہیدی قوانین ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے مسلمانوں کی مرکزی جماعت کے مشورہ سے تجویز کیے ہیں۔ یہ تمہیدی قوانین بوقت ضرورت بدل سکتے ہیں۔

مولانا کا کہنا یہ ہے کہ اسلام کی اجتماعی اساسی تحریک قرآن شریف میں منضبط ہے اور وہ غیر مبدل رہے گی۔ لیکن جہاں کہیں کسی قانون پر عملدرآمد شروع ہوتا ہے تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند تمہیدی قوانین بنائے جاتے ہیں۔ قانون اساسی تو غیر مبدل رہتا ہے، لیکن تمہیدی قوانین ضرورت کے وقت بدل سکتے ہیں۔

ذبح حیوانات صحیح طریقہ نہیں:

(۴ نبوتؐ افراد کے فطری رجحان اور جبلی استعداد کے مطابق ہوتی ہے، اس کے خلاف نہیں ہوتی۔ لہٰذا ذبح حیوانات سے بچنا نبوت کے خلاف نہیں ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ نبوت انسان کی جبلی استعداد کا انکار نہیں کرتی اور انسان کی جبلی استعداد اس کے خاص ماحول سے بنتی ہے مثلاً ہندوستان میں فطرتاً ذبح حیوانات پسندیدہ نہیں، اس لیے اگر کوئی ہندوستانی ذبح حیوانات سے بچے تو اس کا یہ فعل خلافِ نبوت نہیں ہوگا کیونکہ انسانوں کی جو فطرت ہوتی ہے، نبوت اس کے خلاف نہیں جاتی۔ نبوت کا کام یہ ہے کہ فطری رجحانات اور ان کی جبلی استعدادوں کے مطابق ان کے لیے ترقی کی راہیں بتائے۔ (ص ۲۲۵)

(۵) مساوات اور انصاف کی عملی شکل اب خلافتِ راشدہ کی نہیں ہوگی۔ بلکہ اس میں تبدیلی ہوگی۔

اسی طرح خلافتِ راشدہ کے دور میں مساوات اور انصاف کا اصول ایک خاص نہج پر نافذ ہوا۔ اب زندگی بہت کچھ بدل گئی ہے اور اس کے ساتھ زندگی کی ضرورتیں بھی بدل گئی ہیں۔ اس لیے مساوات اور انصاف کا حلقۂ اثر بھی بہت وسیع ہوگا۔ یعنی مقاصد تو وہی رہیں گے لیکن ان کی عملی شکل حالات و اسباب کی تبدیلی کی وجہ سے پہلی سی نہ ہوگی۔ (ص ۲۷) [حوالہ عبیداللہ سندھی محمد سرور]

دارالعلوم دیوبند اور مولانا سندھی:

مولانا سندھی کے ساتھ راقم الحروف کو بھی کافی زمانے تک عقیدت رہی ہے اور جب تک وہ جلا وطن رہے، مراسلت بھی رہی۔ اور میں یہی سمجھا کرتا تھا کہ مولانا سندھی سے صرف ایک مسئلہ میں اجتہادی غلطی ہوئی ہے جس کی وجہ سے اکابر دارالعلوم دیوبند نے ان کا تعلق دارالعلوم سے منقطع کر دیا، لیکن جس وقت میں ان سے مکہ معظّمہ میں حاضر ہو کر ملا اور وہاں کئی ماہ کے قیام میں بیشتر مواقع ملاقات و مجالست کے پیش آئے اور ان کے نئے نئے خیالات و آراء سے واقف ہوا تو میں نے اور میرے ساتھ دوسرے رفقاء نے بھی یہ فیصلہ کیا کہ مولانا سندھی نے اپنی طویل جلا وطنی اور غیر جنس صحبتوں کے ناخوشگوار اثرات کے ماتحت، دارالعلوم دیوبند کی زندگی کے بہتر و خوشگوار اثرات کو ایک ایک کر کے فنا کر دیا ہے۔ اور وہ روس و ترکی کی لادینی تحریک نیز یورپ کی مادی ترقیات اور عقلیت پرستی سے اس قدر مسحور ہو چکے ہیں کہ اب وہ اسلام کی نئی تعبیر کرنے پر مجبور ہیں، جو روس کی اشتراکیت، ترکی کی لادینیت اور یورپ کی مادہ پرستی کے ساتھ گھل مل سکے، چنانچہ مولانا آخر عمر تک اسی کی سعی میں رہے کہ اس درمیانی خلیج کو کسی نہ کسی طرح پاٹ دیا جائے۔

تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

[صدق، ۲۰ نومبر ۱۹۴۴]

اناجیل اربعہ اور صحاح اربعہ یکساں ہیں:

مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے افکار کا ناقدانہ جائزہ مولانا دریا آبادیؒ نے صدق میں پیش کیا اس کے چند اقتباسات درج ہیں:

مولانا عبیداللہ مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ ''اناجیل اربعہ کو صحاحِ اربعہ (صحیح بخاری و مسلم، ابوداؤد، ترمذی) کے درجہ پر رکھ دیا جائے۔ [مقالہ شاہ ولی اللہ، صفحہ ۲۸۲]

اب اس سے اندازہ کیجیے کہ شک وشبہہ کی ان اندھیروں میں مسلمانوں کو جو اسلام ملے گا، اسے قطعی وہی اسلام کیسے قرار دیا جا سکتا ہے، جسے وہ کھو بیٹھے ہیں۔ صحیح بخاری کے متعلق جناب سندھی صاحب اپنے دل میں کچھ اور باتیں بھی رکھتے ہیں۔ مگر لکھا ہے کہ ''مجالس عامہ میں گفتگو کرنے کا روادار نہیں''۔ [صفحہ ۳۰۲ مقالہ شاہ ولی اللہ]

موطا کی اہمیت: سندھیؒ

''مولانا کے نزدیک موطا امام مالک ایک ایسی مرکزی کتاب ہے، جس پر سارے فقہاء اور محدثین متفق ہیں۔ نیز موطاء میں جو روایتیں درج ہیں، ان کی خصوصیت یہ ہے کہ روایت کرنے والوں کی پرکھ کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ کیونکہ عموماً ایک سلسلۂ روایت میں ایک ہی دو راوی ہوتے ہیں، جن کا اکثر حصہ علماء مدینہ سے ہے۔ جن کو ائمہ مسلمین معتمد علیہ اور ثقہ مانتے ہیں''۔ [صفحہ ۲۴۴] اس بیان کے بعد مولانا سندھی تشیب سے گریز کی جانب چلے جاتے ہیں۔

موطا قرآنی تعلیمات کا عربی مرقع ہے: عالمگیر مرقع نہیں

''بیشک مدینہ کی سوسائٹی قرآنی تعلیمات کا نتیجہ تھی اور خلافتِ راشدہ کے دوران میں مسلمانوں کی جو زندگی تھی، وہ قرآن مجید کے احکام کے مطابق ہی تشکیل ہوئی۔ لیکن یہ سمجھ لینا کہ قرآن اسی زندگی میں محدود ہو گیا، ٹھیک نہیں''۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عرب میں مبعوث ہوئے اور عرب ہی ان کے اولین مخاطب تھے، اس لیے ان کی تعلیمات کا ایک قالب عربی ذہنیت کے مطابق ہونا ایک فطری بات ہے''۔

''موطاء دراصل قرآن کی عمومی تعلیمات کے عربی قالب کا مرقع ہے''۔[صفحہ ۳۴۷]

قرآن کی تعلیم کا نتیجہ ایک زمانہ میں ایک خاص مظہر میں جلوہ گر ہوا، اب ضروری نہیں کہ دوسرے زمانہ میں وہ پھر بعینہ اسی صورت میں ظاہر ہو۔[صفحہ ۵۶]

فطرت اللہ: دین اور ضمیر انسانی کا نام ہے

انبیاء صلحاء حکماء ضمیر انسانی کی ترجمانی کرتے ہیں:

لیکن سرور صاحب فرماتے ہیں: [۱]''مولانا کے خیال میں قرآن مجید کل انسانیت کی بنیادی فکر کا ترجمان ہے''۔

[۲]''اس بنیادی فکر کو فطرت اللہ کہہ دیجیے، اسے دین کا نام دیجیے یا اسے ضمیر انسانی سے تعبیر کیجیے''۔

[۳] انہی الفاظ کے بعد فرماتے ہیں''اس ضمیر انسانی کی ترجمانی انبیاء صلحاء وحکماء کرتے آئے ہیں''۔[صفحہ ۳۴]

مذہب اور فلسفہ کا اصل الاصول ایک ہے:

حق کیا ہے: مجموعی انسانیت کا طبعی تقاضہ

[۴] ظاہر ہے کہ مذاہب اور فلسفہ دونوں کا اصل الاصول انسانیت کا یہی بنیادی فکر ہے تو حکماء سے ان کی مراد وہی فلاسفہ ہی کی جماعت ہو سکتی ہے۔۔

مولانا فرماتے ہیں''آخر یہ کیسے پتہ چلے کہ اصل ہدایت کہاں ہے اور حق کیا ہے؟''

''صرف ایک ہی حل'' کیا ہے، فرماتے ہیں''تاریخ کا مطالعہ کرو اور پتہ لگاؤ کہ آخر مجموعی انسانیت کا طبعی تقاضا کیا ہے''۔[صفحہ ۴۳]

کہاں یہ راہ کہ پیغمبر کو جانچ لو اگر ثابت ہو جائے کہ اپنے دعوے میں وہ سچا ہے تو حق و باطل کا معیار بس اسی کی ذات ہے اور کہاں یہ برھمو سماجی مشورہ کہ تاریخ کا مطالعہ کرو اور مجموعی انسانیت کے تقاضے کا پتہ چلاؤ۔

قرآنی قوانین ابدی نہیں:

''مولانا کے نزدیک بھی قرآن میں کہیں کہیں جو احکام ہیں وہ دراصل ایک مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان احکام کو اپنی خاص شکل میں ابدی اور عالمگیر ماننا صحیح نہیں۔[صفحہ ۴۵]

فرماتے ہیں''چونکہ قانون کا قوم کے مزاج اور حالات سے متاثر ہونا ضروری ہے، اس لیے قانون ابدی اور سرمدی ہو نہیں سکتا''۔[صفحہ ۴۵]

''ابدیت صرف حکمت کو ہے اور قانون کی حیثیت ایک نمونہ اور مثال کی ہے''۔[صفحہ ۴۵]

مولانا سندھی کے نزدیک اس قانون کی حیثیت نمونہ اور مثال کی ہے، جسے ابدی اور عالمگیر ماننا صحیح نہیں۔[صفحہ ۵۴]

مولانا یہ کہتے ہیں کہ اسلام کی اجتماعی اساسی تحریک قرآن میں منضبط ہے اور وہ غیر متبدل رہے گی۔

آگے اس کے بعد یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ ''قانون اساسی غیر متبدل ہوتا ہے، لیکن تمہیدی قوانین ضرورت کے وقت بدل سکتے ہیں۔ ہم سنت ان ہی تمہیدی قوانین کو کہتے ہیں۔[صفحہ ۲۴۳]

عہد رسالت کا نظام دائمی نہیں:

''مولانا نے ایک دفعہ سطعات پڑھاتے ہوئے فرمایا کہ ایک خاص زمانہ میں جو نظام بنا ہے وہ آخری نہیں ہوتا۔ وہ انسان کی زندگی کو ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ میں لے جانے کے قابل کرتا ہے''۔[صفحہ ۲۵۹]

اصل دین اور رسم و رواج:

''مولانا کے نزدیک اصل دین یہی ہے، باقی سب رسوم اور روایتیں ہیں'' پھر ان ہی رسوم کے متعلق یہ فرما کر کہ ''بیشک رسوم قابل احترام ہیں۔ لیکن اس وقت تک جب تک وہ حقیقت اور حکمت سے بہرہ رہتی ہیں۔ لیکن جب رسوم کھوکھلی ہو جائیں اور ان کے اندر صحیح روح باقی نہ رہے تو ان کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے''۔[صفحہ ۳۹]

''جس طرح لات و ہبل کو ریزہ ریزہ کر دیا گیا۔ انھیں (یعنی انھیں قرآنی رسوم اور روایتوں کو) توڑ دینا پڑتا ہے''۔ [صفحہ ۳۸]

''قرآن کا سچا ماننے والا وہ ہے، جو ان بے روح رسوم کے خلاف جہاد کرے اور خلوص دل سے رسوم شکن ہو''۔ [صفحہ ۲۸]

آدمؑ ادریسؑ نوحؑ کو ماننے والے صابئین تھے:

''ابدیت صرف حکمت کو ہے''۔

مولانا انسانی فکر کی ارتقائی کشمکش کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک حصہ جو حضرت ابراہیمؑ سے پہلے گزرا ہے، اسے صابی دور کہتے ہیں اور ان کے نزدیک حضرت ابراہیمؑ سے حنیفیت کا دور شروع ہوا۔[صفحہ ۸۵]

''ابراہیمؑ سے پہلا دور صابئین کا تھا۔ (صفحہ ۸۵)

''اس دور کی جس میں آدمؑ، ادریسؑ، نوحؑ، ماقبل ابراہیم علیہ السلام داخل ہیں۔ (صفحہ ۸۵)

مطلب جس کا صاف ظاہر ہے کہ آدمؑ، ادریسؑ، نوحؑ وغیرہ پیغمبروں کی تعلیم ماننے والوں کا نام ''صابئین'' تھا۔

آدمؑ ادریسؑ نوحؑ کے پیرو کار مظاہر قدرت کی پرستش کرتے تھے:

اور وہ تعلیم جو ان پیغمبروں نے ''صابئین'' کو دی تھی کیا تھی۔ یہ فرماتے ہوئے کہ

''اس تمدن کے حامل صابی عقیدے کے تھے''۔

اس عقیدہ کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''یہ لوگ مظاہر قدرت کی پرستش کرتے تھے۔ ان کے نزدیک چاند، ستارے، سورج، خدا کے مظہر تھے۔ مندروں میں ان کے بت بناتے اور ان کی پوجا کرتے''۔ (صفحہ ۱۷۹)

انسان آغاز کے وقت صابئی تھا:

''اس مطلب کو اور واضح الفاظ میں ادا کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، شروع شروع میں انسان خدا کو مادی مظاہر کی شکل میں جان سکا''۔[صفحہ ۱۴۷]

''راویہ صاحب اس کے بعد لکھتے ہیں: مولانا کے نزدیک یہ صابئیت کا دور تھا''۔[صفحہ ۱۴۷]

دوسری جگہ ان ہی الراویہ کی روایت یہ ہے: ''ایک دفعہ مولانا نے فرمایا کہ زندگی کو نقطۂ کمال تک پہنچنے کے لیے ہزارہا مراحل سے گزرنا پڑتا ہے''۔

وہ ہزارہا مراحل کیا ہیں؟ فرماتے ہیں: ''زندگی کی ابتداء معدنیات، نباتات، حیوانات سے ہوئی، پھر انسان معرض وجود میں آیا۔ اس کی فکر کی ابتدائی صورت صابئیت تھی''۔[صفحہ ۱۸۱]

شاہ ولی اللہؒ، ابن عربیؒ امام ربانیؒ
مشرک وموحد میں کوئی فرق نہیں:

''شاہ ولی اللہ بھی ایک نئے فکر کے بانی ہیں''۔

وہ ''ولی اللٰہی فکر جو مولانا سندھی صاحب کا کلام بلکہ تکیہ مراد ہے، کیا ہے؟ ارشاد ہوتا ہے:

شاہ صاحب ابنِ عربی کے عقیدۂ وحدت الوجود کو صحیح مانتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ امام ربانی کے فکر کو بھی ٹھیک سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ دونوں بزرگوں میں اصولاً کوئی فرق نہیں۔

امام ربانی نے جس خیال کو وحدت الشہود سے تعبیر کیا ہے وہ ابنِ عربی کے وحدت الوجود میں خود موجود ہے''۔ (صفحہ ۲۱۱)

ایک حقیقت کی یہ دونوں تعبیریں ہیں تو اب اس میں کون شک کرسکتا ہے کہ شرک بھی توحید ہے اور توحید بھی شرک ہے۔ دونوں ایک ہی چیزیں ہیں جو مشرک ہے وہ بھی موحد اور جو موحد ہے وہ مشرک ہے۔ مولانا سندھی صاحب نے اسی لیے شاہ ولی اللہ سے تصوف کی یہ تعریف کی ہے ''چونکہ یہ فکر (ولی اللہ) ساری انسانیت پر شامل ہے، اسی لیے ایک ہندو اور عیسائی بھی اسے قبول کرسکتا ہے''۔

''شاہ ولی اللہ کا تصوف تو ایسا وسیع تصوف ہے کہ ایسا آزاد منش بھی اسے مان سکتا ہے جو کسی خاص مذہب کا قائل نہیں''۔

''شاہ صاحب کی حکمت کو ماننے سے میرے دل پر یہ اثر ہوا کہ اگر میں کسی دوسرے مذہب کے آدمی یا اس شخص کو جو کسی مذہب کو سرے سے نہیں مانتا، انسانی فلاح و بہبود کا کام کرتے دیکھوں تو میرے دل میں اس کی محبت وعزت جاگزیں ہوتی ہے''۔[صفحہ ۲۸۸]

''وحدۃ الوجود اور وحدت شہود کی اس طرح تشریح کر کے شاہ صاحب نے آریائی اور سامی ذہنیتوں کو ایک نقطہ اتصال پر جمع کردیا''۔[صفحہ ۱۵۵]

''مولانا کے خیال میں قرآن کی تعلیم کا اصل مقصود اس کے معانی ہیں۔ الفاظ پر زور دینے والے عربی تفوق کے داعی ہیں''۔[صفحہ ۲۶۷]

''چنانچہ امام ابوحنیفہؒ فارسی زبان میں نماز پڑھنے کو جائز سمجھتے تھے اور ان کی طرف رجوع کا قصہ گھڑا گیا ہے''۔

[واضح رہے کہ علامہ اقبال بھی بربری زبان میں نماز وشعائر اسلامی کی تعلیم کو اجتہاد عظیم سمجھتے تھے جس کی پیروی مسعود کھور پوش نے پنجاب میں اردو نماز کے سلسلے میں کی، ترکی میں بھی یہ تجربہ دہرایا گیا جس کی اقبال نے تحسین کی کہ اب ترکی قوم دینی تعلیمات سمجھ رہی ہے لیکن اس کا انجام سامنے ہے]۔

انبیاء کا مقصود شخصی انا کی بیداری:

''مولانا نے اس خیال کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اسی ''انانیت'' کا بیدار کرنا انبیاء کی تعلیم کا اصل مقصد ہے''۔

''جب اس زندگی میں کسی فرد کی ''انانیت'' بیدار ہوجائے تو موت کے بعد جب بدن اور اس کی انانیت میں مفارقت ہوجاتی ہے تو یہ انانیت دوسری دنیا میں بلاخوف وخطر ترقی کی راہیں طے کرتی چلی جاتی ہے۔ اسے ہم فوز وفلاح اور جنت کہتے ہیں اور جس کی انانیت خوابیدہ رہی اور ظلم وکفر کی وجہ سے اس نے اپنی ''انانیت'' کو ڈھانپے رکھا تو اس زندگی کے بعد جہنم کا عذاب ان پردوں کو جلا کر پھر اس ''انانیت کو مجلی اور بیدار کردے گا اور جس دن اس شخص کی ''انانیت'' بیدار ہوجائے گی وہ جہنم سے نکل جائے گا''۔

مولانا نے فرمایا ''محشر نام ان تمام ''انانیتوں'' کے ایک مرکز پر جمع ہونے کا ہے''۔ [صفحہ ۱۰۱]

مذہب کی اصلاً روح: فرد کی انانیت کی بیداری

''اس تصوف کا پیام سب کے لیے ہے۔ کسی دھرم یا شریعت کی اس میں تخصیص نہیں''۔ [صفحہ ۱۰۰] تو معلوم ہوا کہ خواہ رسول اللہ صلی اللہ کی کوئی تکذیب کرے، آپ ؐ کی نبوت عامہ اور خاتم النبی ہونے کو جھٹلائے لیکن اپنی انانیت کو بیدار کرلے، بس وہ نجات کا مستحق ہے۔ پس دراصل مذہب کی اصل روح یہی ''فرد کی انانیت کی بیداری'' ہوئی۔

جس قوم میں رہو اس کے قوانین کی پیروی کرو:

شریعت طریقت پر مقدم ہے۔ یعنی ایک شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس جماعت میں رہے، اس کے اجتماعی قانون کو تسلیم کرے۔ یہ نہیں ہوسکتا ہے کہ اس کا جو جی چاہے اسی کو قانون بنالے اور اس پر چلنے کی کوشش کرے۔ اس سے زندگی میں کوئی نظم پیدا نہیں ہوگا اور جماعتی زندگی کا سرے سے شیرازہ بکھر جائے گا۔ [صفحہ ۱۵۱]

جس کا ظاہراً مطلب اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ آدمی جس قوم میں جس ملک میں رہے، اسی قوم وملک کے قوانین کو اپنی شریعت قرار دے۔ اگر آپ اشتراکیوں میں ہیں تو اشتراکیوں کے قانون کو شریعت بنا لیجیے اور ہندوؤں میں ہوں تو ہندوؤں کے قانون کو شریعت تسلیم کرکے اس پر چلیے۔

مسلمان ہندو عیسائی صوفی میں کوئی فرق نہیں:

''ایک مسلمان صوفی جو کامل وعارف ہو، ایک ہندو اور عیسائی صوفی کی اصل سے زیادہ قریب ہے''۔ [صفحہ ۱۳۰]

سرور صاحب فرماتے ہیں: ''آپ (سندھی صاحب) کے خیال میں انقلابی کو اپنے اوپر بڑا اعتماد ہوتا ہے''۔ اس بڑے اعتماد کی تفصیل یہ ہے: ''وہ نہ دوسروں کو خدا مانتا ہے، نہ ان کے اخلاقی معیاروں کو، وہ سماج کا انکار کرتا ہے، حکومت کا انکار کرتا ہے، ماں باپ کے کہنے کو نہیں مانتا، دوستوں اور عزیزوں کا انکار کرتا ہے''۔ [صفحہ ۵۶] خیر یہی سب کہنے کہلانے کے بعد آخر میں سندھی صاحب اس راز کو طشت از بام اس موقع پر کرتے ہیں کہ ''دراصل ہمارا اعتماد علی اللہ اسی اعتماد علی النفس کا حاصل ہے''۔ (صفحہ ۵۶) اور آگے ارشاد ہوتا ہے:

اللہ سے مراد نفس ہے:

''روس جانے سے پہلے گو اس حقیقت کا شعور رکھتا تھا، لیکن اس کو زبان پر کبھی نہ لاتا تھا۔ پر اب برملا کہتا ہوں''۔ (صفحہ ۵۶)

یعنی اللہ کا لفظ روس جانے سے پہلے اعتاد کے اس سلسلے میں جو سندھی صاحب بولتے یا سمجھتے تھے، اس سے واقعی اللہ نہیں، بلکہ خود ان کا نفس مراد تھا۔ پر زبان پر لانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی، لیکن جو بات آپ کے اندر تھی اب برملا اس کا اعلان فرمایا جاتا ہے۔

شاہ ولی اللہ کی حکمت شریعت سے بھی بالا ہے:

شاہ صاحب کی حکمت عمومی چیز ہے، یہ کسی شریعت وملت کے حدود میں مقید نہیں۔ ایک ہندو بھی اس سے استفادہ کر سکتا ہے اور تو اور ہر وہ شخص جو کسی مذہب کا پیرو نہ ہو، اس کے لیے جاذب توجہ ہو سکتی ہے۔ یہ حکمت خالص انسانی حکمت ہے اور انسانیت کے سوا کسی قید کو قبول نہیں کر سکتی''۔[صفحہ ۳۲۶]

گویا شاہ ولی اللہؒ بھی ایک قسم کے کبیر داس اور نانک تھے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو ہر چیز عرب کے دماغ کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ جاتی تھی، لیکن شاہ ولی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دماغ ایسا دماغ تھا جو کسی زمانی، مکانی، قومی قید کو قبول نہیں کرتا تھا۔

[صدق: ۱۳ر جون تا ۱۴ر جولائی ۱۹۴۵ء]

علامہ مشرقی مرحوم کے افکار و نظریات:

علامہ مشرقی سے مفتی محمد شفیعؒ کے استفسارات

آپ کی عبارات، تذکرہ، اردو، دیباچہ ۸۶۔۸۷ اور تذکرہ عربی ص ۴۷ و حاشیہ ص ۶۷ و ص ۱۲ وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عقائد سرے سے کوئی چیز نہیں۔ ہر شخص جو چاہے عقائد رکھے۔ اس کے اسلام اور ایمان پر اس کا کچھ اثر نہیں۔ نیز انھیں عبارات میں یہ بھی مذکور ہے کہ مسلمان ہونے کے لیے کسی کلمہ کے اقرار و شہادت کی کوئی ضرورت نہیں۔

مذہب اسلام راہ نجات نہیں: ہر مذہب باعث نجات ہے

کیا مذہب اسلام راہِ نجات نہیں، بلکہ ہر مذہب پر رہ کر نجاتِ آخرت حاصل ہو سکتی ہے؟ جیسا کہ ''تذکرہ'' صفحہ ۵۵، ۵۶، ۵۷ سے معلوم ہوتا ہے۔ اگر آپ کا خیال یہی ہے تو پھر'' ان الدین عنداللّٰه الاسلام، ومن يبتغ غير الاسلام دينـا فلن يقبل منه'' کا کیا مطلب ہے۔ نیز آیت کریمہ ''فـلاور ربک لايـومـنون حتىٰ يحكموک فيما شجر بينهم'' کا کیا حاصل ہے؟

نصاریٰ و بت پرست ابرار ہیں:

تذکرہ عربی صفحہ ۳۰، ۴۳، ۴۴، ۴۶، ۴۸، ۴۹، ۵۵، ۵۶، ۶۹، ۸۹، ۹۳ میں اور اشارات صفحہ ۹۹ میں بصراحت مذکور ہے کہ موجودہ نصاریٰ اور بت پرست اقوام جو باہم منظم اور زمین پر غلبہ وتمدن رکھتے ہیں، وہ حقیقی معنی میں موحد ہیں، مومنین، صلحاء، ابرار و مفلحین، اور آخرت میں نجات وحسنات کے مستحق ہیں۔ لیکن اس کے خلاف آپ نے رسالہ ''جھوٹ کا پول'' ص ۹ میں لکھا ہے کہ انگریز، جرمن، جاپان وغیرہ مسلمانوں کے نزدیک ہرگز مومن نہیں، نہ ہو سکتے ہیں نہ ''الجنة'' کے حقدار۔

غلبہ وسلطنت سے محروم گمراہ ومشرک ہیں: وہ انبیاء جنھیں غلبہ نہ ملا وہ؟

کیا امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ کے تمام مسلمان جن کو دنیا میں غلبہ وسلطنت حاصل نہیں، سب کے سب گمراہ، کافر، مشرک ہیں؟ جیسا کہ تذکرہ عربی کے عبارات مذکورہ، سابقہ سوال نمبر ۳ سے ظاہر ہوتا ہے اور اگر آپ کا یہ عقیدہ نہیں ہے تو ان عبارات کا مطلب کیا ہے؟

کیا بجز تنازع للبقاء اور دنیا میں تحصیل غلبہ وسلطنت کے اسلام میں کوئی عبادت اور کوئی عمل مطلوب ومقصود نہیں، جیسا کہ عبارات تذکرہ اردو دیباچہ ص ۹۳-۹۴، ۹۷، ۹۸، ۱۰۰اور تذکرہ عربی ص ۱۴۳ سے سمجھا جاتا ہے۔

اگر آپ کا عقیدہ یہی ہے تو آیت ''الذی ان مکناھم فی الارض اقامو الصلوہ'' میں جو غلبہ وتمکن فی الارض کو غیر مقصود اور اس سے اصل مقصد اقامت صلوٰۃ وغیرہ کو قرار دیا ہے اس کا کیا حل ہے اور حدیث ''بنی السلام علی خمس شھادۃ ان لاالہٰ الا اللہ و ان محمد رسول اللہ و اقام الصلوٰۃ و ایتاء الزکوٰۃ'' [الحدیث] کا کیا مطلب ہے؟

جسے دنیا میں غلبہ نہیں وہ آخرت میں ناکام ہے: انبیاء بھی ناکام رہے؟

تذکرہ عربی ص ۳۲-۵۴ میں مذکورہ ہے کہ جس شخص کو دنیا میں نعمت غلبہ وسلطنت حاصل نہیں، اس کو آخرت کی نعمت بھی نہ ملے گی۔ جو یہاں محروم ہے وہ آخرت میں بھی محروم رہے گا۔ دریافت طلب یہ امر ہے کہ اگر آپ کے نزدیک آخرت کی نجات اور نعمتیں اور جنت کا ملنا اس پر منحصر ہے کہ دنیا میں سلطنت وغلبہ اور مال ودولت کا مالک ہو، تو وہ انبیاء علیہم السلام جو دنیا میں اپنی قوموں پر غلبہ نہ پا سکے، بلکہ ان کے ہاتھوں شہید ہو گئے، جس کی خبر قرآن مجید کی متعدد آیات میں ہے: ''ویقتلون النبیین'' [وغیرہ] کیا معاذ اللہ جنت آخرت سے محروم ہیں؟ اور حضرت لوط علیہ السلام جو کفار کے نرغہ سے اپنے گھر والوں کو بھی نہ بچا سکے اور فرمایا ''لو کان لی بکم قوۃ او آوی الی رکن شدید'' ان کے بارے میں کیا فیصلہ ہے؟

اسلام کے نئے دس اصول:

تذکرہ میں اسلام کے دس اصول قائم کیے گئے ہیں۔ توحید فی العمل، وحدت امت، اطاعتِ امیر، جہاد بالمال، جہاد بالسیف والانفس، ہجرت، استقامۃ فی السعی والتوکل فی النتائج، حلم، مکارم اخلاق، ایمان بالآخرۃ۔ ان کو علامہ صاحب اپنی اصطلاح میں عشرہ مبشرہ کہتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ وہ دس اصول ہیں، جن پر میری دانست میں نبی آخرالزماں کے لائے ہوئے اسلام کی تمام بنیاد ہے۔ کلمۂ شہادت، صوم وصلوٰۃ، حج زکوٰۃ، سب اسلامی شعائر جو آجکل ارکان اسلام سمجھے جاتے ہیں، ان ہی دس سے ماخوذ ہیں۔ کلمہ شہادت صرف توحید کا رسمی اظہار ہے۔ صوم صرف جہاد نفس کا ادنیٰ مظہر ہے۔ پورا مظہر تو وہ ہے، جب پلٹن نمبر ۳۶-۱۴ء میں افریقہ کی پہاڑی پر بوٹ ابال کر کھاتی تھی۔ الصلوٰۃ صرف اطاعت امیر اور وحدتِ امیر ہے [قواعد پریڈ اسی میں شامل ہے] الحج صرف وحدتِ امت اور جہادِ نفس ہے [خواہ ایک تجارتی مشن جاپان کو ہی جائے] الزکوٰۃ صرف جہاد مال ہے [اگرچہ وارفنڈ میں دیا جائے] وغیرہ وغیرہ۔ یہی عشرہ مبشرہ دین فطرت ہے۔ یہی لائحہ عمل ہے، جس پر عمل کر کے ہر قوم آرام پاتی ہے۔ متمکن فی الارض ہے، مورثِ زمیں ہے اور جس سے اجل زدہ قوم [مسلمان] اکثر ناواقف ہیں۔ ذالک الدین القیم ولاکن اکثر الناس لایعلمون.

یورپ کا غلبہ کیسے ممکن ہوا؟ اصل غلبہ دین یہی ہے
مسلمانوں نے غلبہ انہی اصولوں سے حاصل کیا تھا

پھر دعویٰ ہے کہ ''یورپ آج ان دس اصولوں پر قائم ودائم ہے۔ اسی کی برکت سے متمکن فی الارض اور وارثِ زمین ہے''۔ توحید فی العمل ان کی یہ ہے کہ کسی مزاج کا وایسرائے آئے، مگر توحید فی السیاست واللہ پلومیسی سب کی ایک ہی ہوتی ہے۔ وحدتِ امت ان کے لباس ہی سے دیکھ لو۔ اطاعت امیر ان کا فطری حصہ ہے۔ ادنیٰ مظہر اس کا ولایت میں کسی وزیر اعظم کی کسی اسپیچ کے موقع پر نظر آجاتا ہے۔ جہاد بالمال کی مثال وہ یتیم خانے ہیں، جو ولایت میں بے ماں باپ کے بچوں کے لیے جگہ

جگہ قائم ہیں۔جن کی کثرت سے ہندوستان کی سرکوبی کے لیےفوجی طاقت کا استحکام کیا جاتا ہے۔ جہاد بالسیف،خرطوم میں دو لاکھ مسلمانوں کا آن واحد میں صفایا یا ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں پرامن خوں ریزی، ہجرت! از لندن تا آسٹریلیا، جاوا، سماترا، نیوزی لینڈ، از قاف تا قاف کجا از مکہ تا مدینہ صرف چند منزل! استقامۃ فی السعی ، لارڈ کلایو کے دکن میں مساعی اور ۵۷ء کا غدر، علم، ڈارون کی تھیوری اور نو دو نے اٹھارہ بیس دو نے چالیس، مکارم اخلاق، پیرس کی واحد مکمل عیاشی اور یورپ کا بالعموم قابلِ رشک کیرکٹر۔ایمان بالآخرۃ از اول تا آخر زیرو۔

مصنف تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ ابتدائے اسلام میں مسلمان بھی ان دس اصولوں کے پابند تھے،جس کے صلے میں حسب وعدۂ قرآنی وہ بہت جلد جہات الارض کے مالک ہوگئے تھے۔شام کا تمام پرفضاء علاقہ جو دنیا کا بہشت ہے،معمولی کوشش سے ان کے قبضے میں آ گیا تھا۔

انسان آدم کی اولاد نہیں:

مصنف تذکرہ علماء کو مسائل ضروریات دین پر عامل ہونے سے بہت عتاب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور خصوصاً استنجاو طہارت کا بار بار طعنہ دیتا ہے۔مصنف ڈارون کے نظریہ کا ثبوت قرآن شریف سے دیتے ہیں۔انسان حضرت آدم کی اولاد نہیں ہیں۔آدم کا پتلا بنا کر اور اس میں پھونک مار کر زندہ کر دینا بھان متی کا کھیل ہے۔خدا تعالیٰ ایسی حرکت نہیں کرتا۔اس کے ثبوت میں جگہ جگہ قرآنی شہادتیں صاف اور غیر ماڈل دیتا جاتا ہے۔علامہ نے تو بہت لمبی بحث کی ہے،جس کا مطلب صرف یہ ہے کہ کئی قسم کے مختلف جرثومہ کے میل سے ایک نئی نسل پیدا ہوئی۔ پھر اسی طرح متبائن میل سے دوسری بہتر اور نئی نسل پیدا ہوئی۔اسی طرح لکھوکھا برس میں یہ متبائن میل جول توالد تناسل کے ذریعہ نئی سے نئی بہتر اور نئی نسل پیدا ہوئی۔اسی طرح لکھوکھا برس میں یہ متبائن میل جول توالد تناسل کے ذریعہ نئی سے نئی بہتر سے بہتر نسل پیدا کرتا چلا آیا۔اتفاق حسنہ سے اور حسبِ مشیت ایزدی کسی دو غیر جنس کے میل سے بذریعہ توالد و تناسل انسان بن گیا[یا بن گئے؟] پھر اشارتاً مشورہ دیتا ہے کہ اب بھی اگر یہ سلسلہ توالد تناسل کا متبائن اجناس کے ذریعہ سے جاری رکھا جائے تو ممکن اور یقینی ہے کہ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی میل سے کوئی بہتر سے بہتر نسل، جو موجودہ انسان سے بدر جہا ارفع وانسب ہو، پیدا ہو سکے [تعزیراتِ ہند اس ترقی کو کب پسند کرتی ہے!] جس کو ملائکہ کہا جا سکے۔[صفحہ نمبر ۱۶ سطر ۲۸ وصفحہ ۳۷ مقدمہ تحت المتن دونوں موقعوں کو ملا کر دیکھیے اس کا نام وحدت اصل ونسل رکھا ہے۔[وحدت کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتا] یعنی توالد و تناسل میں بھی بلا امتیاز متحد ہونا چاہیے۔ایک جگہ اس کو صراط مستقیم اور علم صالح بھی فرمایا ہے۔

علامہ مشرقی: نماز کے قریب نہ جاؤ

لاتقربوا الصلوٰۃ و انتم سکاریٰ کے مفہوم کا سربستہ راز اور گہرے مطلب کا سربمہر خزانہ تمہاری ہرزہ سرائی اور انسانیت سے گری ہوئی تعلیم جمعیۃ اقوام اتحاد عمل کے ہفوات کو حرف غلط کی طرح محو کر رہا ہے اور تودہ بارود کی طرح اپنی تہدیدی چنگاری سے فنا کر رہا ہے،جس کے بعد نہ راکھ ملتی ہے نہ بطور یادگار کوئلہ باقی رہتا ہے۔یعنی اس فرضی اور بے معنیٰ صلوٰۃ اس بیہودہ اور انسانیت سے گرے ہوئے فعل صلوٰۃ اس مجنونانہ اور پاگلانہ حرکت صلوٰۃ کے قریب نہ جانا لاتقربو! پاس نہ پھٹکنا۔لاتقربوا۔اس کی ہوا نہ کھانا، لاتقربوا، ورنہ کہا جائے گا کہ بلاشبہ تم نے بھنگ پی رکھی ہے۔انتم سکاریٰ تم سودائی ہوگئے۔انتم سکاریٰ تمہاری حالت نشہ والوں کی سی ہے۔انتم سکاریٰ تمہاری اپنی حالت درست نہیں۔**انتم سکاریٰ، وغیرھا من الھفوات و الاباطیل.**

علامہ مشرقی کے افکار:

جہاں تک ان کی ضخیم و مبسوط کتاب تذکرہ کا تعلق ہے، وہ خیالات وعقائد، باوجود دعوے اسلام وحبِ اسلام کے

نہایت درجہ لغو اور گمراہ کن ہیں۔ صاحب تذکرہ نے ایک بالکل نئے اور انوکھے قسم کا ''اسلام'' پیش کیا ہے، جس کے لحاظ سے صحیح مسلم و مومن صرف آج کل کے انگریز اور دوسری ''ترقی یافتہ'' قومیں ٹھہرتی ہیں۔ جنت سے مراد اسی دنیا کے باغ، گلزار و سبزہ زار ہیں اور انہارِ جنت سے مراد یہیں کے دریا وغیرہ۔ چنانچہ اس معنی میں آج بھی انگریز جنت پر قابض ہیں، وقس علیٰ ہذا۔ ہر بنیادی و مرکزی عقیدہ اسی طرح توڑ مروڑ کر درج ہے اور ائمہ سلف و علمائے حق کے حق میں نہایت درجہ غلیظ اور ناقابلِ تحمل سب وشتم اس کے علاوہ۔ کتاب ۲۴ء میں مدیر صدق کی نظر سے گزری تھی، اور اس وقت پڑھ کر بہت ہی غصہ آیا تھا۔ تلبیس، تدلیس و تحریف کی عجیب و غریب مثالیں ملی تھیں۔

خاکسار تحریک کا اصل مقصد: مولوی کا خاتمہ

''خاکسار'' تحریک کے لٹریچر میں اس کے مقاصد کے سلسلہ میں بار بار اعلان کیا گیا ہے کہ اس کا مقصد مولویوں کے بتائے ہوئے ''غلط مذہب'' کو فنا کر کے اس کی جگہ ''اصل اور صحیح اسلام'' کو رائج کرنا ہے۔ چنانچہ ''خاکسار تحریک'' کے جو چودہ نکات یا چودہ اصول ہیں، ان میں تیسرا نمبر ہی یہ ہے۔

مولوی کا آج کل کا بتایا ہوا راستہ غلط ہے، خاکسار سپاہی اس غلط مذہب کو صفحہ زمیں سے مٹانے اور اس کی جگہ ''نبوی اسلام'' کو پھر رائج کرنے کے لیے اٹھا ہے''۔ [غلط مذہب نمبر۴، ص۱۶]

''میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ خاکسار ہندوستان میں صرف اس لیے اٹھے ہیں کہ مولوی کا اسلام غلط ہے''۔ [ص۶]

''ہاں خاکسار تحریک تیرہ سو پچاس برس کے بعد جس سچے اور اصلی مذہب کی طرف ہر مسلمان کو پھیر لے جانے کے لیے تیار ہوئی ہے، وہ مذہب خدا اور اسلام کے باہتھیار سپاہی بننا ہے، یہی سچا اور اصل ''اسوۂ رسول'' ہے۔ اسی کے متعلق لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ قرآن میں لکھا ہے۔ اسی سپاہیانہ زندگی کو ہم خاکسار ''اسوۂ رسول'' سمجھتے ہیں اور اس کے سوا ہم تمہارے بنائے ہوئے کسی ''اسوۂ رسول'' کو چلنے نہیں دیں گے''۔

اسلام کے لیے مصطفیٰ کمال کو دیکھو:

''خاکسار تحریک نے تیرہ سو پچاس برس کے بعد پہلی دفعہ دنیا کو بتایا ہے کہ ''اسوۂ حسنۂ رسول'' ''دینِ اسلام'' الغرض خدا کا سچا ''مذہب'' صرف اور صرف سپاہیانہ زندگی ہے''۔ [قول فیصل ص۸]

''میں تمہیں اس کیمپ میں کئی قرنوں کے بعد پھر بتلانا چاہتا ہوں کہ از روئے اسلام عمل کیا شے ہے، کس قطع کے عمل سے خدا کے یہاں جزا ملتی ہے اور کس طرح کا عمل ہے، جس کا لازمی نتیجہ خدا کی سزا ہے''۔ [ص۱]

پھر ''عمل'' کی وہی ''تذکرہ'' والی تشریح کرنے کے بعد فرمایا:

''عمل کے اسلامی معنی اگر سمجھنا چاہتے ہو تو جاؤ مصطفیٰ کمال کو دیکھو کہ کیا کر رہا ہے، امان اللہ کو دیکھو کہ اس نے کیا کیا تھا''۔ الخ [ص۴]

پھر اسی سلسلہ میں فرماتے ہیں:

''الغرض قرآن کا عمل صرف ہاتھوں اور پیروں کا عمل ہے، جنگی اور فوجی عمل ہے، خدا کا بندہ بن کر زمین پر حکمراں ہونے کا عمل ہے، اللہ کا سپاہی بن کر زمین پر غالب ہونے کا عمل ہے''۔ [ص۷]

نماز بے کار: انگریزوں کی نماز اصل نماز ہے

چند سطر کے بعد لکھا:

''نماز، نفل، درود، تسبیح، دعا، از روئے قرآن کسی معنوں میں عمل نہیں۔ نماز صرف مسلمانوں کی دنیا میں ایک ناقابلِ شکست اور عالمگیر جماعت پیدا کرنے کا ہتھیار ہے''۔[ص ۸]

اسی سلسلہ میں انگریزوں کے متعلق لکھا کہ:

''انگریزوں کو دیکھ لو، ان میں قیام جماعت موجود ہے، ان کی نماز تمہیں نظر بھی نہیں آتی، لیکن خدا کی بخشش کا بے پناہ ہاتھ ان کو دنیا پر غالب کر رہا ہے''۔[۱۲]

مسلمانوں کا امیر محاسبے سے آزاد ہے یعنی فرشتہ ہے

مسلمان کا امیر دراصل رسول خداصلعم کا جانشین ہے، اس نقطۂ نظر سے اس کا نام خلیفۃ النبی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب نبی کے دیے ہوئے حکموں اور اعمال پر خدا کے سوا کسی کی گرفت نہیں تو اسلام کا امیر اور خلیفۃ النبی بھی مسلمانوں کے تمام مواخذہ سے باہر ہے''۔[ص ۱۸] مسلمان کا امیر امیر ناطق ہے، امت کی ہر گرفت سے آزاد ہے، اس کا معاملہ صرف خدا اور رسولؐ سے ہے۔ صرف خدا اور رسولؐ ہی اس سے نبٹ سکتے ہیں، اس کو چاہیے کہ مشورہ کرے، لیکن خود خدا کے مانند وہ لا یشرک فی حکمہ احد'' کا مصدق ہے اور لاشریک حاکم ہے''۔[ص ۲۰]

''دوسرا مرحلہ حاکم اور امیر جماعت کی غیر مشروط اطاعت ہے۔ جب تک انسانی اقوام میں رسول رہنما رہے، پیغمبروں کی اطاعت غیر مشروط رہی، اب رسولوں کے بعد امیر جماعت کی اطاعت بلا قید شرط ہے''۔

خاکسار تحریک: خاموشی مقصد زندگی

اسی جگہ اس خاموشی کا اثر اور نتیجہ یہ لکھا ہے اور صحیح لکھا ہے کہ'' خاموش نظام کا ادنیٰ کرشمہ جنگ عظیم میں یہ تھا کہ ایک پکا اور نماز گزار مسلمان سپاہی اپنی رجمنٹ کے ساتھ پنجاب سے گاڑی میں سوار ہوتا تھا، خاموشی سے جہاز میں سوار ہوکر چند دنوں کے اندر بغداد کے محاذِ جنگ میں حاضر کیا جاتا تھا، وہاں اس غریب اور بے بس حیوان کو حکم تھا کہ اپنے مسلمان بھائی کے سینے گولیوں سے چھلنی کر دے۔ اس کو تعمیل کے سوا چارہ نہ تھا، کیونکہ سپاہی کا کام خاموشی ہے۔ خاکسار تحریک کا پیش نہاد قوم کو خاموش کر دینا ہے''۔[قول فیصل ص ۱۵]

''پچھلی جنگ عظیم میں اگر ہندوستانی مسلمانوں نے انگریز کے حکم سے بغداد جا کر ترکوں کے سینے گولیوں سے چھلنی کر دیے تو اس کی وجہ ان کی سپاہیانہ تربیت تھی۔ جماعت میں داخل ہوکر ہر شخص حکم ماننے پر مجبور ہے''۔[ص ۱۱]

سول نافرمانی: لاہور میں خاکسار تحریک کا انجام

''حکومت نے خاکساروں کے حامیوں کو پکڑنا شروع کیا، انجمن حمایتِ اسلام سے جواب طلبی کی گئی کہ اسلامیہ کالج کی امداد کیوں نہ بند کر دی جائے۔ لاہور پر تعزیری پولیس قائم کر دی گئی اور اس کا خرچ کئی لاکھ روپیہ خاکساروں کے حامیوں پر ڈال دیا گیا۔ پولیس نے مسجدوں پر چھاپے مارے اور چند ہی دنوں میں لاہور بلکہ پنجاب کی ایک ایک مسجد کو خاکساروں کے وجود سے خالی کرا لیا۔ اب مسلمانانِ لاہور نے بھی رنگ بدلا۔ صرف چند ہی منٹوں میں ان کی تمام ہمدردیاں کافور ہوگئیں، انھوں نے خاکساروں کو اجتماع جمعہ کے لیے دریاں دینے سے انکار کر دیا۔ خیمے دینے سے انکار کر دیا، بلکہ بے شمار لوگوں نے سنہری مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنا بھی چھوڑ دی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ ہوا کہ جب خاکسار لاہور کی کسی مسجد میں مورچہ لگاتے تو محلّہ کے مسلمان خود پولیس کو بلا کر انھیں گرفتار کرا دیتے۔ مختصر یہ کہ سب قصہ ختم ہوگیا۔ اس کے بعد اطلاعات آنے لگیں کہ خاکسار مسلمانوں پر احسان کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ حکومت پنجاب کو معاف کر دیا جائے''۔

سول نافرمانی کو پوری طرح شکست ہو چکی تو خاکساروں نے مسٹر جناح کو اختیار دیا کہ آپ حکومتِ پنجاب سے ہماری مصالحت کرا دیں، تمام دنیا نے اس مصالحت کا مضحکہ اڑایا۔ پہلے نافرمانی ۲۷رجون تک بند کی گئی، پھر معیاد ۱۰رجولائی تک بڑھائی گئی۔اسی اثناء میں اعلان ہوا کہ ۱۱راگست کو دوبارہ سول نافرمانی شروع ہوگی۔ پھر ۱۰ کو اعلان ہوا کہ ۲۰راگست تک سول نافرمانی ملتوی کی جاتی ہے''۔

۲۰راگست بھی آکر گزر گئی تو ۲۱راگست کو خاکسار بابِ عالی سے اعلان ہوا کہ

۱] اب خاکسار،حکومت ہند کے اعلان کی خلاف ورزی نہ کریں گے۔

۲] اب خاکسار، اپنی سرگرمیاں خدمتِ خلق تک محدود رکھیں گے۔

۳] اب خاکسار، بیلچے لے کر فوجی پریڈ نہ کریں گے۔

۴] اب خاکسار،فوجی وردی نہ پہنیں گے۔

ان تمام ''خاکساریوں'' کے بعد امید یہ ظاہر کی گئی کہ اب حکومتِ پنجاب اور خاکساروں کے درمیان ''مصالحت'' ہو جائے گی!''مصالحت'' کی گفتگو شکست کامل کے بعد شروع ہو گئی!

حکومت ہند کو پچاس ہزار سپاہیوں کی پیشکش: میری جائیداد واپس کر دیں

حیرت زدہ دنیا کی حیرت ابھی رفع ہونے بھی نہ پائی تھی کہ یکم ستمبر خود جناب والا ''علامہ'' مشرقی کا بیان شائع ہوا کہ

''میں حکومت ہند کو اب پھر ۵۰ ہزار سپاہیوں کی پیشکش کرتا ہوں۔ہم پر نازی ہونے کا الزام غلط ہے۔ سانحۂ لاہور میں خاکسار میری ہدایت سے جمع نہیں ہوئے تھے۔ اب خاکسار تحریک صرف خدمتِ خلق کے اصول پر عمل کرے گی۔ ہم ۲۸ر فروری والے حکم پر بھی کوئی اعتراض نہ کریں گے۔ مجھے وزیر اعظم پنجاب کی سب شرطیں منظور ہیں اور میری درخواست وزیر اعظم سے ہے کہ وہ ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں۔قیدی رہا کر دیں اور میری ذاتی منقولہ جائیداد اور ۲ لاکھ روپیہ واپس کر دیں''۔
[صدق،۲۲رستمبر،۱۹۴۰ء]

خاکسار تحریک کا انجام جس کی پیش گوئی کی گئی تھی

خاکسار تحریک کے بارے میں مولانا مودودیؒ نے جو پیش گوئی کی تھی وہ پوری ہوئی۔انھوں نے لکھا تھا علاوہ بریں مشرقی صاحب کی تحریر یا تقریر یا اور ان کی حرکات سب کی سب اس امر کا پتہ دیتی ہیں کہ وہ ایک غیر متوازن دماغ کے آدمی ہیں۔ان کی قیادت میں جو تحریک چلے گی، اس کی مثال بالکل ایسی ہوگی، جیسے موٹر کو کوئی مخمور آدمی چلا رہا ہو۔نہیں کہہ سکتے کہ شراب کے نشے میں وہ موٹر کو کس درخت سے ٹکرا دے گا یا کسی گڑھے میں پھینک دے گا۔ سیاسی تحریکوں کو چلانے کے لیے نرے اشتعال اور جوش و غضب سے کام نہیں چل سکتا، اس کے لیے ٹھنڈے دل و دماغ کی ضرورت ہے اور یہ چیز مشرقی صاحب کو نصیب نہیں ہے۔ مذہبی عقائد سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تب بھی ہم یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ سیاسی ہی حیثیت سے مسلمانوں کو کسی صحیح راستہ پر چلا کر بخیریت منزل کامیابی تک پہنچا دیں گے۔ وہ زیادہ سے زیادہ بس یہی کر سکتے ہیں کہ یونیفارم، قواعد پریڈ، نعروں اور جھنڈوں کی نمائش سے سطح بین عوام کو اپنی طرف کھینچیں اور بناوٹی الفاظ، جھوٹے پروپیگنڈا اور اشتعال انگیز مضامین کی شراب پلا کر انھیں اس فریب میں مبتلا کر دیں کہ وہ ایک طاقت بن گئے ہیں۔ یہ فریب کچھ دن خوب چلے گا اور بالآخر عظیم صدمہ کے ساتھ اس بری طرح ٹوٹے گا کہ مدتوں کے لیے مسلمانوں پر یاس و ناامیدی اور بے اعتباری چھا جائے گی اور مدتوں اس قابل نہ ہو سکیں گے کہ کسی تحریک اور کسی رہنما پر اعتبار کر سکیں۔[صدق، یکم جنوری ۱۹۴۰ء]